طارق تُو کہاں ہے؟

طارق

تو کہاں ہے؟

از

باجی نسرین

ناشرین
ایم۔آئی۔کے
۳۶ فیروز پور روڈ ــــ لاہور

بار ——————— ششم

تعداد ——————— ایک ہزار

قیمت ——————— دس روپے

۱۹۹۶ء

جملہ حقوق بحق ناشرین محفوظ ہیں

مینیجر ایم۔ آئی۔ کے ۳۶ فیروز پور روڈ، لاہور نے رفاعی پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر شائع کیا۔

پیش لفظ

اس دلچسپ کہانی میں ایک ایسے بچّے کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جو بچپن ہی میں زندگی کے ایک اہم ترین مسئلہ سے دوچار ہُوا اور پھر کس طرح اُس نے اُس کا حل تلاش کیا۔

مُصنّفہ نے جس طریقہ سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے وُہ نہایت ہی دلچسپ ہے۔ کہانی کا طرزِ بیان اتنا خوش کُن ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی توجہ کو بھی کھینچ لیتا ہے جو شاذ و نادر ہی کوئی کتاب پڑھتا ہو۔

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے یہ ایک کسوٹی کی مانند ہے کہ وُہ اس کو پڑھنے سے اپنے اخلاقی کردار کو پرکھیں اور اس کا جائزہ لیں۔ ہمیں پوری اُمید ہے کہ یہ پڑھنے والوں کے لیے برکت کا باعث ہوگی۔

اے۔ این۔ والٹر

پہلا باب

لاہور شہر پر اب تک بڑی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے تمام لوگ سوئے پڑے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی مرغ زور سے اپنے پر پھڑپھڑاتا اور خاموشی کو چیرتی ہوئی "ککڑوں کوں" کی آواز سنائی دیتی۔ بڑے سے پیپل کے درخت میں کچھ طوطے آرام کر رہے تھے، اب وہ بھی اس شور میں شریک ہو گئے اور ایک نئی صبح کی خوشی میں زور زور سے ٹین ٹین۔ ٹائیں ٹائیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہر درخت میں شور وغل سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

کیا آج لوگ اٹھنا ہی نہیں چاہتے!! رات تو بیت چکی ہے اور دن نکلنے ہی والا ہے!

صحن کی دیوار پہ کوؤں نے "کائیں کائیں" کی آوازیں لگائیں۔ انہوں نے چارپائیوں کی طرف دیکھا جن پر لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ کائیں کائیں کا شور ان کے آرام میں مخل نہ ہوا۔ چادروں میں سر لپیٹے وہ

خراٹے لے رہے تھے۔ جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے پڑے تھے۔
کوّوں نے سوچا" یہی تو وقت ہے۔ چلو ہم آزادی سے صحن میں جائیں۔ کھانے کو کچھ نہ کچھ ضرور مل ہی جائے گا۔ رات کو بچّوں نے روٹی کے ٹکڑے گرائے ہوں گے، یا شاید کچھ اور چیز مل جائے"۔ اُنہوں نے اپنے پر پھیلائے اور پھڑ پھڑ کرتے صحن میں اُتر گئے۔ ایک کو چپاتی کا ٹکڑا ملا۔ اس نے جھٹ اُسے اپنی چونچ میں دبا لیا۔ بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور کوّے نے اس پر حملہ کر دیا اور ٹکڑا چھین لیا۔ صحن ان کے شور سے گونج اُٹھا۔

اب اِدھر اُدھر لوگ بیدار ہونا شروع ہو چکے تھے۔
"ہیں!! دن نکل آیا اتنی جلدی؟ ابھی تو تھکان بھی نہیں اُتری۔ دس منٹ اور سو لیتے ہیں"۔ اور وہ آدمی کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔
لیکن مکھیاں کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں" ان پوستیوں کو ہم اٹھاتی ہیں"۔ کوئی کسی کے ہاتھ پر، کوئی پاؤں پر رینگنے لگی۔ جہاں کہیں کوئی ننگا منہ نظر آیا، کوئی کان میں گھسی، کوئی ناک میں۔ انہوں نے سونے والوں کو اتنا تنگ کیا کہ وہ غصّہ میں اٹھ بیٹھے۔
محلّہ شاہ جمال میں بھی لوگوں نے ہلنا جلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ چارپائیوں کو چھوڑ کر دن کے کام کاج کے لیے تیار ہونا شروع ہو گئے تھے۔
کئی گھروں سے "تھپ، تھپ، تھپ" کی آواز بلند ہوئی۔ عورتوں نے روٹیاں پکانی شروع کر دی تھیں۔ یہ آواز کتنی شیریں تھی!۔
محلے کی تنگ گلی میں ایک جنگلی کتا آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ وہ بھوکا تھا اور اِدھر اُدھر کچھ سونگھ رہا تھا۔ اُسے خیال ہی نہ رہا کہ نالی میں گندہ پانی بہرا

ہوا ہے۔ وہ سیدھا اُس میں جا گرا، بچارے کی چیخ نکل گئی اور جب نالی سے باہر نکلا تو چاروں ٹانگیں کیچڑ سے بھری ہوئی تھیں۔ ڈر کے مارے اس نے اپنی دم ٹانگوں میں دبائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔

اچانک وہ ایک جگہ رُکا اور خوشی میں دُم ہلانے لگا۔ اُسے تازہ سینکی ہوئی روٹی کی خوشبو آئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ فقط ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا۔ آہستہ سے اس نے پردہ کو ایک طرف ہٹایا اور وہاں ہی کھڑے کھڑے حسرت بھری نگاہوں سے اُس عورت کو دیکھنے لگا جو اپنے خاندان کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔

داخل اپنے کام میں اتنی مصروف تھی کہ اُس نے گندے کتے کو دیکھا تک نہیں۔ وہ پیڑھی پر بیٹھی روٹیاں بیل کر توے پر ڈال دیتی پھر جلدی جلدی الٹتی پلٹتی اور صاف کپڑے سے انہیں دباتی۔

داخل درمیانہ قد اور قدرے بھاری بدن کی عورت تھی۔ چہرے سے مہربان معلوم ہوتی تھی۔ چال ڈھال آہستہ تھی لیکن اپنے کام کاج میں وہ بہت ہوشیار تھی۔ جب وہ روٹیاں بنا رہی تھی تو اپنے بچپن کا زمانہ یاد آیا جب وہ رائے ونڈ کے نزدیک ہی ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ "ہمارا گاؤں کتنا اچھا تھا۔ کاش! وہاں کوئی کام نکلے تو ہم واپس چلے جائیں اور وہاں ہی رہیں۔"

اُس نے صحن میں سوئے ہوئے بچوں پر نظر ڈالی۔ دل میں کہنے لگی۔ کاش! بچپن میں مجھے بھی اس طرح سونا نصیب ہوتا۔ میرے چاروں بھائی تو ٹانگیں پسارے سوئے رہتے اور مجھ غریب کو جو ان کی ایک ہی بہن تھی۔ ماں کی مدد کرنے کے لیے صبح ہی صبح اٹھنا پڑتا تھا پھر بھائیوں میں سے

تو ایک نہ ایک ہر وقت رُعب ڈالتا رہتا تھا۔ راخل اِدھر آؤ۔ راخل پانی پلاؤ۔ راخل میری قمیض دھو دو۔ ہائے، وُہ کتنا اچھا وقت تھا، اور ماں کی مدد کرنا کتنا اچھا کام تھا۔ ہم سب کتنے خوش تھے ہم غریب تو ضرور تھے، لیکن سب ایک خوشحال گھرانے کی طرح رہتے تھے ماں باپ میں بھی کبھی تلخ کلامی یا لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔"

اُسے اب بھی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے صبح سویرے اس کا ابّا کھیتوں کی طرف جا رہا ہے۔ وہ خوشی خوشی گھر سے جاتا اور ہنستا ہوا گھر واپس آتا۔ واپسی پر تھکا ہوا تو ضرور ہوتا تھا لیکن ہمیشہ مطمئن نظر آتا۔ راخل کو اب وہ وقت یاد آیا جب اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔ "میرے والدین نے تو مجھے کافی دیر تک اپنے پاس رکھا تھا۔ میری ساری سہیلیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں لیکن میں اب تک گھر بیٹھی تھی۔ جب صادق سے میری شادی ہوئی۔ تو میری عمر بیس سال سے زیادہ تھی۔ والدین نے صرف اس لیے اس سے میری شادی کی کہ وہ ہمارے گاؤں کے نزدیک ہی رہتا تھا۔ اکثر وہ ہمارے ہاں آتے رہتے تھے اور انہیں آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وُہ خود اُن کے پاس پہنچ جاتی۔"

اب اُسے شادی کے بعد کا زمانہ یاد آیا" پانچ سال تک میرے کوئی بچّہ نہ ہوا۔ ہائے وہ کتنی مایوسی کا زمانہ تھا۔ پہلے پہل تو ہم صادق کے والدین کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وُہ کھیتی باڑی کرتے تھے اور صادق کھیتوں میں اپنے باپ کی مدد کرتا تھا۔ لیکن ان کی آمدنی دو خاندانوں کے گذارے کے لیے بہت کم تھی۔ پانچ سال کے بعد خداوند نے ہمیں، ایک بیٹا بخشا، ہم نے کتنی خوشی منائی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ہم نے فیصلہ

کیا کہ ہم لاہور آ جائیں۔ یہاں صادق کو مزدوری کا کام مل گیا۔ لیکن مجھے اپنے پیارے گاؤں کی گلیاں اور لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیت کتنے یاد آتے ہیں۔"

"ارے میں سوچتی سوچتی کہاں کی کہاں چلی گئی۔ اور انہیں دیکھو۔ سب منہ ڈھانکے گہری نیند سو رہے ہیں"۔ "رحمت، بشیرہ، آستر، اٹھو بھی سورج چڑھ گیا ہے۔"

اس نے سب سے چھوٹے بیٹے فلپ کو آواز نہ دی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ سویا رہے تاکہ وہ صبح کا کام آسانی سے کر لے۔

اب اس کے خاوند نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ وہ دبلا پتلا اور لمبے قد کا آدمی تھا۔ لیکن چہرے سے بہت رحم دل معلوم ہوتا تھا۔ مونچھوں سے چہرہ بھرا بھرا نظر آتا تھا۔ اس نے قمیض پہنی اور دھوتی باندھی ہوئی تھی بالکل ویسے جیسے گاؤں میں پہنتا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی جوتیاں پہن لیں۔ اس کی بیوی نے اسے آواز تو نہ دی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے اٹھ جانا چاہیئے کیونکہ کام پر بھی تو جانا تھا۔

"رحمت، اٹھو بیٹے"۔ منہ پر سے چادر کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔

رحمت نے دوسری طرف کروٹ بدلی اور بڑبڑایا "ابا جی، سونے بھی دیں.... کیا جلدی ہے۔ مجھے تو ابھی تک بڑی تھکان ہے۔"

رحمت ایک خوبرو گیارہ سال کا لڑکا تھا لیکن اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا معلوم ہوتا تھا۔ سر پر گھنے سیاہ بال تھے۔ منہ گول تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی تھیں اور چہرہ یہ بتاتا تھا کہ اس کا دل نرم اور مہربان ہے۔ باپ اس کی بغل میں گدگدی کرتے ہوئے کہا "بیٹا، اٹھ جاؤ ناشتہ بالکل تیار ہے

رحمت بستر پر ادھر اُدھر مچلنے لگا اور ہنستے ہوئے بولا "ابّا جی۔ ٹھہریں ابّا جی۔ میں بس ایک منٹ میں آیا" لیکن وہ اسی طرح لیٹا ہی رہا اور ادھ کھلی آنکھوں سے اپنی بہنوں کو دیکھنے لگا۔

بشیرہ جو آٹھ سال کی تھی، پلنگ پر بیٹھی اپنی آنکھیں مل رہی تھی۔ اس نے ایک گہری اباسی لی اور سر پہ زور زور سے ہاتھ ملا۔ اس کی چھوٹی سی چٹیا ادھر اُدھر ہل رہی تھی۔ بشیرہ بنی بنائی اپنی ماں کی مانند تھی۔ قدرے بھاری بدن اور چلنے میں سست۔ اُس کا چہرہ بھی گول تھا اور گالوں کی ہڈیاں قدرے ابھری ہوئی تھیں۔

دُوسری لڑکی، آسترَ کی عُمر چھ سال تھی۔ وُہ بھی اپنی ماں کی شکل پر تھی۔ اُس کی آنکھیں ابھی تک نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس نے جلدی جلدی اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو زور سے کھجلایا اور ایک مرتبہ پھر بیٹھے بیٹھے اُس پر نیند کا جھونکا آ گیا۔

اب صرف فلپ ہی تھا جو گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ کوئی ڈیڑھ سال کا ہو گا۔ اُس کا ناک نقشہ بالکل رحمت سے ملتا جلتا تھا۔ صرف فرق یہ تھا کہ وہ کافی موٹا تھا۔

ماں نے توے پر آخری روٹی ڈالی کہ چائے کا پانی اُبلنے لگا۔ اُس نے جلدی سے پتّی ڈالی اور پیالے زمین پر اتارے۔ پیالوں میں چائے انڈیلتے وقت وہ دل میں کہہ رہی تھی "یہ بچّے بھی عجیب ہیں۔ سب کچھ تیار کر کے ان کے آگے رکھو لیکن یہ سُستی کے مارے ہاتھ ہلانا بھی پسند نہیں کرتے۔ میں بھی دوبارہ انہیں آواز نہیں دوں گی" یہ کہتے ہوئے وہ سیدھی کھڑی ہوئی ہاتھ سے بالوں کو پیچھے کی طرف کر کے انہیں چوٹی میں باندھ دیا۔

اتنے میں اُسے قدموں کی آواز سُنائی دی۔ اس کا خاوند آ رہا تھا۔ وہ پیڑھی پر بیٹھ گئی اور پیالے میں چائے ڈال دی۔ جب صادق چائے اُٹھانے کے لیے جھکا تو اس نے روٹی دیتے ہوئے اُس سے کہا "آپ کو تو آج پھر دیر ہو گئی ہے۔ جلدی ناشتہ کر لیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں کام پر پہنچ ہی جاؤں گا۔" چائے کا ایک گھونٹ بھر کر اس نے کہا "آج پھر گرمی کتنی زیادہ ہے۔"

راحل نے دوپٹے کے سرے سے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا: "کاش ہمارے پاس بھی پنکھا ہوتا۔"

صادق اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر ہنس پڑا۔ "ارے واہ تمہارے خیالات تو بڑے اونچے ہیں لیکن خیر کبھی تو لے ہی لیں گے ہم بھی پنکھا۔"

رحمت ابھی تک لیٹا ہوا تھا۔ آہستہ سے بولا "ابا جی، ہمیں یہیں پلنگ پر چائے دے دیں۔"

"ارے او نواب زادے۔ ابھی تک تو اُٹھا نہیں۔" باپ جو اس کی طرف جھپٹا تو رحمت کود کر نیچے اُتر گیا اور ہنستے ہوئے اپنی ماں کی طرف دوڑا۔

"چل بیٹھ اِدھر اور یہ لے اپنی چائے۔ خبردار جو کل کی طرح آج بھی چائے گرائی۔"

"امی جی آپ تو ہمیشہ مجھے ننھا بچہ ہی سمجھتی ہیں۔ معلوم ہے میری عمر کیا ہے؟ گیارہ برس ہے۔ گیارہ برس۔"

رحمت کے ہاتھ میں پیالہ تھا۔ روٹی لینے کو جو ہاتھ بڑھایا تو گرم گرم چائے اُس کے پاؤں پر گر پڑی۔ "ہائے مر گیا، ہائے رے میری ماں۔"

دونوں چھوٹی بہنوں نے رحمت کی جو یہ حالت دیکھی، تو وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

اب رحمت چارپائی پر اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مزے سے چپڑی ہوئی تازہ روٹی کھانے اور چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

لڑکیاں بھی اپنی ماں کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئیں اور ناشتہ کرنے لگیں۔ سب بڑے خوش تھے اور ہنسی خوشی ناشتہ کر رہے تھے۔

جب ماں ناشتہ کر چکی تو پیالہ ایک طرف رکھ دیا اور دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "سنو جی۔ آج مجھے خاں صاحب کے گھر صفائی کرنے جانا ہے۔ فلپ تمہارے پاس ہوگا۔ اسے اکیلا نہ چھوڑ دینا۔"

"تو رحمت بھائی کہاں جا رہا ہے؟ کیا وہ گھر پر نہیں رہے گا؟"

"ہم نے سوچا ہے کہ رحمت بھی اپنے باپ کے ساتھ اب جایا کرے تاکہ کچھ نہ کچھ پیسے کما سکے۔ آج وہ اپنے باپ کے ساتھ گلبرگ مارکیٹ جائے گا اور وہاں اپنی قسمت آزمائے گا۔"

آستر نے بشیرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بشیرہ۔ ابا جی رات کو بتا رہے تھے نا، کہ رحمت بھائی اب کام کرے گا۔"

بشیرہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "ارے۔ پھر تو ہم گھر میں اکیلے رہ جائیں گے۔"

دونوں لڑکیوں نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ لیکن رحمت اداس نظر آ رہا تھا۔ رحمت نے چائے کا پیالہ زمین پر رکھ دیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ "ابا جی، آج تو سخت گرمی ہے۔ کیا آج ضرور ہے کہ میں کام پر جاؤں اگر آندھی بارش آ گئی تو پھر کیا ہوگا؟"

باپ ہنس پڑا "اُٹھ اوئے بہانے باز! گھبراتا کیوں ہے! ڈرپوک کہیں کا۔"

"ابّا جی، نہ ہی میں ڈرتا ہوں اور نہ ہی بہانے بنا رہا ہوں۔ میں ضرور مارکیٹ جاؤں گا۔ لیکن آج موسم بہت خراب ہے۔"

رحمت کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اُس نے ابّا کے سامنے کھڑے ہو کر کہا: "ابّا جی۔ آج تو میں بالکل نہیں جا سکتا۔ امّی جی خان صاحب کے گھر جا رہی ہیں اور یہ لڑکیاں اکیلی ہوں گی۔ پھر میں کیسے جا سکتا ہوں۔"

باپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا: "بہت اچھے۔ کیسی باتیں بناتے ہو، لڑکیوں کی بالکل فکر نہ کرو۔ وہ بہت ہوشیار ہیں۔ اب تو جب بھی ان کی ماں گھر پر نہ ہوگی وہ اکیلے ہی رہیں گی۔"

پھر کھڑے ہو کر اُس نے رحمت کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور کہا۔ "رحمت ہم فکر مند کیوں ہو؟ کام بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔ بس مارکیٹ میں اِدھر اُدھر گھومتے رہنا ہے اور ذرا ہوشیاری دکھانی ہے۔ جہاں بھی کوئی موٹر آکر رُکی، بس دوڑ کر گئے اور اُسے صاف کر دیا۔ دس منٹ کا کام ہوگا اور ہمیں چار چھ آنے مل جائیں گے، رحمت تم تو جانتے ہی ہو کہ ہمیں پیسوں کی کتنی ضرورت ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے ابّا جان، لیکن سارا دن وہاں رہنا اور کام کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔"

نامعلوم کیوں اسے خوف محسوس ہو رہا تھا مارکیٹ میں نہ ہی اُس کا باپ ہوگا اور نہ ہی کوئی اور دوست۔ وہ سارا دن کیا کرے گا!

والد نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "میں جانتا ہوں کہ ہمارے پڑوسیوں میں کوئی بھی اپنے بچوں کو ایسے کام پر نہیں لگائے گا۔ یہ بڑا نیچ کام ہے۔ لیکن میں نے اور تمہاری امّی نے سوچا ہے کہ پیسے کمانے کے لیے کسی قسم کے کام سے بھی شرمانا نہیں چاہیئے۔ دکاندار سے ادھار لینا یا پڑوسیوں سے مانگ کر کھانے سے تو یہ کام بُرا نہیں ہے بیٹے۔"

رحمت اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید رہا تھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا: "ابّا ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ لیکن بازار میں اکیلے جانے سے میں گھبراتا ہوں۔ نا معلوم وہاں کیسے کیسے لوگ ہوں اور پھر میں دوپہر کو اپنے دوست طارق سے بھی نہ مل سکوں گا اور نہ ہی ہم اکٹھے کھیل سکیں گے۔"

رحمت چاہتا تھا کہ وہ زور زور سے روئے۔ آہ۔ اُس کا عزیز دوست اسے نہ مل سکے گا۔ اُسے یاد آرہا تھا کہ کس طرح وہ دونوں طارق کی بھیڑیں لے کر باہر کھیتوں میں چلے جاتے یا پھر نہر میں نہاتے ہیں۔ جب طارق پانی میں ڈبکیاں لگاتا تو بندر کی طرح شکلیں بناتا تھا۔ پانی میں مچھلی کی طرح غوطہ لگانا یا سر کے بل کھڑے ہو جانا تو اُس کے نزدیک معمولی بات تھی۔ پھر رحمت یوں بھی طارق کی بڑی عزت کرتا تھا کیونکہ وہ سکول میں پڑھتا تھا اور بہت کچھ جانتا تھا۔

کسی نے آہستہ سے اس کا کان کھینچا تو رحمت چونک اٹھا۔ اُس کا والد اس سے کہہ رہا تھا: "ہمت کرو رحمت۔ پیسے کمانے میں بڑا مزہ آتا ہے اور یہ بھی ایک فن ہے۔ مارکیٹ میں اور بھی بہت سے لڑکے ہیں۔ لیکن تم ان سے زیادہ مضبوط اور ہوشیار ہو۔ انہیں بتا دو۔ کہ تم اُن

سب سے زیادہ ہوشیار اور محنتی ہو۔"

یہ بات رحمت کے دل پر لگی۔ اُسے جوش آیا کہ وہ دوسرے لڑکوں کو بتا دے کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔ "بہت اچھا ابا جی۔ مجھے یہ منظور ہے۔" وہ کود کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ زمین پر سے اُس نے چائے کا پیالہ اٹھایا اور اپنی ماں کو دے دیا۔ وہ خوشی میں گانا گانے لگا۔ اور ناچنے لگا۔ اس کی بہنوں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا۔ اب تو ان کی ماں نے غصہ میں کہا۔ "بند کرو یہ بدتمیزی۔ رحمت جلدی کرو۔ چلو ہاتھ منہ دھو لو۔"

رحمت نلکہ پر گیا۔ اور زور زور سے ہتی چلانے لگا۔ شاید وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ اُس میں کس قدر جوش ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پانی بھرا اور منہ دھویا۔ لیکن ماں نزدیک ہی کھڑی اُس کی اس حرکت کو دیکھ رہی تھی۔ کہ پانی رحمت کے منہ کو چھوتا بھی نہیں۔ رحمت میں دیکھ رہی ہوں۔ اچھی طرح صابن لگا کر منہ دھو۔" ماں نے ذرا غصے میں کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"توبہ ہے۔ ماں تو ایسے پیچھے پڑی رہتی ہے جیسے میں معصوم بچہ ہی ہوں۔" اب وہ اپنی قمیض اتار کر نلکے کے نیچے کھڑا ہو گیا اور رعب دار آواز میں بولا۔ "بشیرہ ادھر آؤ۔ ذرا نلکہ چلاؤ۔ میں منہ دھو رہا ہوں۔" نہ معلوم کیوں آج بشیرہ پہلی مرتبہ خاموشی سے آئی اور نلکہ چلانے لگی۔ وہ بھلا پہلے کب اپنے بھائی کا حکم مانتی تھی۔

رحمت نے منہ دھو لیا۔ دھوتی باندھی اور صاف قمیض پہنی۔ آج تو کہے بغیر اُس نے اپنے بال بھی بنائے۔

اس کی امّی جب اندر سے نکلی تو رحمت نے اسے لڑکیوں کو یہ حکم دیتے ہوئے سُنا" بشیرہ، آستر۔ ٹوکری میں صاف کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں رکھی ہیں۔ تمہیں جب بھوک لگے تو کھا لینا۔ مَیں جا رہی ہوں۔"

رحمت دل میں بڑبڑایا۔" آج میں کام پر جا رہا ہوں اور کسی کو بھی میرے دوپہر کے کھانے کی فکر نہیں ہے۔" وہ بھوکا بھی رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اُس نے اپنی قمیض کی جیب میں مرُنڈے ڈال لیے تاکہ انہیں کھاتا رہے۔

"کیوں بیٹا تیار ہو نا؟" باپ نے سر پر اپنی پگڑی باندھی، دیوار کے ساتھ کھڑی سائیکل کو پکڑا اور باہر کی طرف چل دیا۔

"رحمت کہاں رہ گئے۔ جلدی آؤ۔"

"خدا حافظ امّی جی۔" رحمت نے مُسکراتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور باہر کی طرف بھاگا۔

جلدی میں اُس نے ماں کی نصیحت کو نہ سُنا جو کہہ رہی تھی کہ" آرام سے رہنا اور لوگوں کے ساتھ بدتمیزی سے پیش نہ آنا۔"

ماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ رحمت مارکیٹ میں اکیلا ہی ہو۔

رحمت اپنے باپ کے پیچھے بھاگا۔ ہوا میں اس کی دھوتی اِدھر اُدھر اُڑ رہی تھی۔ آخر اُس نے اپنے باپ کو جا ہی لیا۔" ابّا جی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ شکر ہے گلی تنگ ہے اور آپ سائیکل پر سوار نہ ہو سکے ورنہ شاید میں تو مارکیٹ تک بھی آپ کو پکڑ نہ سکتا۔" رحمت نے ہانپتے ہوئے کہا۔

باپ نے ہنس کر کہا۔" اچھا ہے۔ دوڑو گے تو فالتو چربی پگھل جائے گی۔"

جب وہ سڑک پر آ گئے، تو صادق سائیکل پر سوار ہو گیا اور رحمت کود کر پیچھے جا بیٹھا۔ اچانک ہی ان کے سامنے ایک جنگلی کتا آ گیا تو رحمت کے باپ نے زور سے چیخ مار کر اُسے ڈرایا اور بھگا دیا۔ رحمت پیچھے بیٹھا سواری کا مزہ اٹھا رہا تھا اور سڑک پر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ چند لڑکیاں سکول کی وردیاں پہنے اُچھلتی کودتی بس کی طرف بھاگی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے دِل میں بڑا خوش ہُوا اور کہا "شکر ہے میں اس مُصیبت سے آزاد ہوں اور مجھے سکول جانا نہیں پڑتا۔"

ان کے پاس سے دو تین ٹیکسیاں بھی گزریں جن پر صندوق اور بستر بندھے ہوئے تھے۔ شاید وہ سٹیشن کی طرف جا رہی تھیں۔ رکشا بھی تیزی سے اڑے چلے جا رہے تھے۔ رحمت نے ایک آئس کریم والے کو بھی دیکھا جو بھیڑ میں اپنی ریڑھی لیے جلدی جلدی آگے بڑھ رہا تھا۔ اور بار بار آواز لگا رہا تھا "آئس کریم والا۔ مینگو۔ چاکلیٹ۔ دو آنے چار آنے..... آئس کریم والا۔"

رحمت کے منہ میں پانی بھر آیا اور للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کو شرارت سوجھی۔ اس نے بھی نقل اتارتے ہوئے زور سے آواز لگائی "آئس کریم والا۔ دو آنے چار آنے آئس کر....."

"باپ نے زور سے کہا" چپ اوئے آئس کریم والے"

اب وہ دونوں ایک پل پر سے گزرے۔ رحمت کی نظر جب پانی پر پڑی تو وہ مچل اٹھا۔ ابا جی، ابا جی۔ آؤ نہریں نہائیں.... ہیں ابا جی!"

صادق پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور

بولا۔ "اُف، آج تو بہت گرمی پڑے گی"۔ رحمت نے پیچھے بیٹھے ہوئے کہا۔
"اباجی۔ آپ تو بہت تھک گئے ہوں گے کیونکہ آج تو میں بھی پیچھے بیٹھا ہُوا ہوں"۔

صادق نے سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا آج تو میں تمہیں لے آیا۔ کل میں پیچھے بیٹھوں گا اور تم سائیکل چلاؤ گے"۔

رحمت ہنسنے لگا۔

اب وہ مارکیٹ میں پہنچ چکے تھے۔ رحمت کو کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی۔ سوچنے لگا "کیا ہوگا میرے ساتھ یہاں سارا دن؟"

"اترو بیٹے! مارکیٹ آگئی ہے۔ میں اب آگے جارہا ہوں جہاں بہت سے مستری اور مزدور اس انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ کوئی آجائے اور انہیں اُجرت پر کام دے دے"۔

باپ نے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی سائیکل پر آگے بڑھ گیا۔

دُوسرا باب

رحمت نے بڑی لاپرواہی سے موٹریں صاف کرنے والا کپڑا اپنے کندھے پر ڈالا اور اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی "بڑی رونق والی جگہ ہے۔ لیکن کوئی موٹر تو نظر نہیں آتی جسے میں صاف کردوں۔ جو رکتی ہیں، وہ ایک دم چل دیتی ہیں۔ شاید لوگ اپنے اپنے دفتروں کو جانے کے لیے جلدی میں ہیں۔" دِل میں کچھ ایسے ہی سوچتے سوچتے وہ سڑک کے کنارے زمین پر بیٹھ گیا، اپنی ٹھوڑی دونوں ہاتھوں میں رکھ کر وہاں کی گہما گہمی کو دیکھنے لگا۔

پرلے کونے پر ایک قصائی کی دُکان تھی۔ قصائی گاہکوں کے انتظار میں اپنی دُکان کے تھڑے پر چوکڑی مارے بیٹھا تھا۔

رحمت نے اپنے دل میں کہا "قصائی کا کام بھی کتنا اچھا کام ہے۔ کاش میں بھی گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا اور کلہاڑی سے ہڈیوں کو توڑ سکتا۔" اپنے خیالات میں گم اس نے اپنے بائیں ہاتھ پر دائیں ہاتھ کو زور سے مارا جیسے وُہ واقعی ہڈی توڑ رہا ہو۔ جب بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا تو کھڑے ہو کر گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ جو اس نے پڑوس میں

شادی کے موقع پر سُنا تھا۔

قصائی کی دُکان کے ساتھ ہی ایک پھل والے کی دُکان تھی۔ پھل والا دُکان کے اندر سے پھلوں کی ٹوکریاں باہر نکال رہا تھا۔ اسے بری طرح سانس چڑھی ہوئی تھی۔ ٹوکری کو زمین پر رکھ کر وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ وہ ادھیڑ عُمر کا بھاری بدن والا انسان تھا اور اس کا بڑا سا پیٹ دُور سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مُنہ پر داڑھی اور لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالا اور پسینہ پونچھا پھر چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ شاید کسی کی انتظار میں تھا۔

پھل والے کی یہ حالت دیکھ کر رحمت کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اسی لمحے رحمت نے دیکھا کہ وہ پھل والا اُسے اشارے سے بلا رہا ہے"۔ او چھوکرے، اِدھر آ۔ چل اوئے جلدی۔"

رحمت سمجھ نہ سکا کہ پھل والا کیوں اُسے بلا رہا ہے۔ اس لیے وہ اپنی جگہ پہ ہی کھڑا رہا۔

"ابے سُنا نہیں تو نے۔ میں تجھے ہی بلا رہا ہوں۔"

"آیا جی۔" رحمت پھرتی سے سڑک پار کر کے پھل والے کے پاس گیا۔ وہ کچھ جھینپ سا رہا تھا۔ "آپ نے بلایا ہے مجھے جناب۔"

پھل والے نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور ایک لمبا سا کش لگا کر کہا۔

"ارے تجھے کچھ اُونچا سُنائی دیتا ہے۔ سُنتا ہی نہیں۔ چل، دُکان کے اندر سے ٹوکرے نکال کر باہر رکھ۔ آج معلوم نہیں راجو کو کیا موت پڑی ہے۔ آیا ہی نہیں۔"

"فکر نہ کر بادشاہو۔ ہم جو حاضر ہیں۔"

"چل میں تجھے بتا دوں وہ ٹوکریاں کہاں پڑی ہیں۔" پھل والا آگے آگے چلا اور دکان کی پچھلی جانب ایک تنگ و تاریک کمرے میں رحمت کو لے گیا۔

"سن بے۔ یہ سب ٹوکریاں باہر نکالنی ہیں۔ باہر میں بتاؤں گا کہ ان کو کس طرح لگانا ہوگا۔"

رحمت کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ ٹوکریوں کی طرف دیکھتے ہوئے دل میں کہنے لگا۔ "چلو کچھ کام تو ملا۔"

پھل والے نے اونچی آواز میں کہا۔ "خبردار جو ایک ٹوکری بھی گری۔ سن اوئے اگر پھل کا ایک دانا بھی چرایا۔ تو مار مار کر دنبہ بنا دوں گا۔"

"نہیں جناب۔ فکر نہ کریں آپ۔" رحمت نے ٹوکری اٹھا کر سر پر رکھی اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر آیا۔ "کہاں رکھوں جناب!"

"آموں والی ٹوکریاں ادھر رکھ۔ اور باقی سب ادھر جمع کر دے۔"

"جو حکم سرکار۔" رحمت جب دوسری ٹوکری نکال کر لایا تو اس وقت پھل والا اپنی جگہ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

"واقعی یہ سوچ رہا ہوگا کہ میں پھل نہیں چراؤں گا۔ اور پھر یہاں تو اتنا زیادہ پھل ہے۔ اگر میں ایک دانا چرا بھی لوں تو اسے کیا فرق پڑے گا۔"

رحمت نے جلدی جلدی ساری ٹوکریاں باہر نکال دیں۔ اب صرف ایک رہ گئی تھی اور وہ اس نے جان بوجھ کر اب تک نہیں اٹھائی تھی۔ اس ٹوکری میں کیلے رکھے ہوئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ آخری ٹوکری اٹھاتے وقت ایک کیلا چرا لے گا۔ اسی وقت ایک مدھم سی آواز اس

کے کان میں آئی "اگر تیرے ماں باپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تو نے چوری کی ہے تو وہ کیا کہیں گے؟"

لیکن اس نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا "یہ تو ٹھیک ہے لیکن کیلا تو میری دل پسند چیز ہے۔ پھر اگر اس امیر پھل والے کا ایک کیلا چرا بھی لیا، تو اُسے کون سا گھاٹا پڑ جائے گا۔"

وہ آواز بار بار کہتی رہی "اس طرح تجھے چوری کی عادت پڑ جائے گی، چوری نہ کر..... چوری نہ کر" لیکن رحمت یہی کہتا رہا "نہیں نہیں یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو گا۔"

اب رحمت نے باہر کی طرف جھانکا کہ کوئی ہے تو نہیں۔ گچھے میں سے اس نے ایک کیلا توڑا اور جھٹ اپنی دھوتی میں اڑس لیا۔ کیلے کو اور زیادہ چھپانے کے لیے اس نے وہ بڑا سا کپڑا اس جگہ پر اور زیادہ لٹکا دیا۔

پھر اس نے ٹوکری اٹھائی اور باہر لا کر رکھ دی "چودھری صاحب کیا میں پھل کے ٹوکروں پر سے مٹی جھاڑ دوں۔ بڑی مٹی پڑی ہوئی ہے۔"

پھل والے نے کہا "چل جلدی کر۔ جب تک میں روپے کا بھان لے لیتا ہوں" وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ لڑکا محنتی نظر آتا ہے اور اگر ایسے ہی کام کرتا رہا تو ضرور زندگی میں کامیاب ہو گا۔

جب رحمت کام ختم کر چکا تو پھل والے نے اپنی جیب میں سے بیس پیسے نکال کر اُسے آواز دی "ادئے لڑکے ادھر آ۔ یہ لے اپنے پیسے"

رحمت خوشی خوشی آگے بڑھا کہ اپنی مزدوری وصول کرے۔ اُس نے

اپنے ہاتھ بڑھائے اور پھل والے نے دس دس پیسے کے دو سکے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

صرف بیس پیسے!! اُسے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ دونوں سکے پھل والے کے قدموں میں پھینک کر چلا جائے۔ لیکن پھر اپنے پر ضبط کر لیا۔ قمیض کی جیب میں پیسے ڈالے اور سلام کر کے وہاں سے چلا گیا۔

پھل والا لڑکے کی طرف دیکھتا ہی رہا "محنتی لڑکا ہے جو بھی دیا چپ کر کے لے لیا ہے"

رحمت آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے دوسری طرف چل دیا۔ اچانک اُسے موٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک غیر ملکی عورت ہے۔ اس کے گھنگھریالے بال ہیں اور وہ خود موٹر چلا رہی ہے۔ اس نے جلال سٹور کے سامنے اپنی موٹر کھڑی کی۔

اس سے پہلے کہ وہ عورت موٹر سے باہر نکلتی۔ رحمت نے موٹر کے شیشے صاف کرنے شروع کر دیئے اور ہاتھ پھیلا کر "بخشیش بخشیش" کہنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ اس نے مسکین سا چہرہ بھی بنا لیا۔

اس عورت نے غصہ میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور انگریزی زبان میں اسے بکنے لگی "ان کم بختوں کی وجہ سے انسان بازار بھی نہیں آسکتا۔ جھٹ چمٹ جاتے ہیں۔ یہ تو انسان کو پاگل بنا دیتے ہیں"۔ غصہ میں رحمت کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "چلو چلو صبح کار دھلوائی ہے اور یہ لگا ہے گندے کپڑے سے شیشے میلے کرنے۔ بس بس چلو چلو"

اونچی ایڑی والی جوتی کی وجہ سے پکے فرش پر کھٹ کھٹ کھٹ

کھٹ کرتی وہ دکان کے اندر چلی گئی۔ رحمت اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی نارنجی رنگ کی پھول دار فراک کتنی اونچی تھی۔ اُسے زور کی ہنسی آگئی۔ تو اُس نے جلدی سے وہ کپڑا اپنے مُنہ میں ٹھونس لیا۔

"دھڑم" کوئی چیز رحمت کے پاؤں میں گری۔ وہ چونک گیا اور اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کس نے اُس کی طرف کوئی چیز پھینکی ہے۔ وہ یہ بھی انتہائی کوشش کر رہا تھا کہ وہ گھبرایا ہُوا نظر نہ آئے جب اُسے کوئی بھی نظر نہ آیا تو اُس نے نیچے کی طرف دیکھا جہاں وہ کھڑا تھا۔

اُس کی ہنسی نکل گئی "ارے وہ تو وہی کیلا ہے۔ مَیں تو بالکل بھول ہی گیا تھا" اُس نے جلدی سے کیلا اُٹھایا اور پٹڑی کے کنارے گھاس پر جا بیٹھا۔ کیلے کو اُنگلیوں میں پکڑا اور دو منٹ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کا چھلکا اتارا اور دانتوں سے آہستہ آہستہ کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ چھلکا اس نے دُوسرے ہاتھ میں پکڑا اور اُسے ہَوا میں آگے پیچھے گھماتا رہا۔ جب وہ کیلا کھا رہا تھا تو سڑک کے پار کونے میں اُسے کوکا کولا کی لال دکان نظر آئی۔

"وہ کوکا کولا! کیلا کھانے کے بعد اگر ایک ٹھنڈی یخ بوتل مل جائے تو کیا کہنے"

اُسے بڑا افسوس ہُوا کہ کیلا اتنی جلدی ختم ہوگیا۔ اس نے قمیض کی آستین سے مُنہ پونچھا اور چھلکے کو گھما کر سر کے پیچھے کی طرف پھینک دیا۔ دھوتی جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اُسی لمحے ایک گرج دار آواز اُسے سُنائی دی "ادئے نواب کے بچے کیا مطلب ہے تیرا۔ کیلا کھا کر چھلکا میرے سر پر دے مارا۔ کرن

سیدھا تجھے!"

گھبرا کر رحمت نے پیچھے دیکھا۔ غصّہ بھرے ہوئے چہرے کو دیکھ کر رحمت گھبرا سا گیا۔

"تو نے یہ چھلکا میری چھابڑی میں پھینکا ہے، چکھاتا ہوں تجھے ابھی اس کا مزہ۔"

رحمت نے یہ چھلکا چھابڑی میں سے اُٹھا کر پرے پھینک دیا۔

"معاف کرنا جی۔ غلطی سے یہ آپ کو جا لگا۔" پھر وہ چھابڑی کو غور سے دیکھنے لگا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے بٹن۔ گنگھیاں، پن، کانٹے اور بہت سی ایسی چیزیں تھیں۔

"تم یہ چیزیں بیچتے ہو! خوب، انہیں بیچنے میں تو بڑا مزہ آتا ہوگا۔ کاش میں بھی ایسی چیزیں بیچ سکتا!"

"مزہ کیا آتا ہے خاک۔ بے وقوف مزہ تو اسی میں آتا ہے کہ سارا دن کھیلتے رہیں اور بس۔"

رحمت زور سے ہنس پڑا۔ "واقعی تم نے میرے دل کی بات کہی ہے۔ اور ہاں بھئی معاف کرنا، میں نے جان بوجھ کر چھلکا تمہاری طرف نہیں پھینکا تھا۔ وہ تو اچانک ادھر آ گرا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہاں تمہارا نام کیا ہے؟" "میرا نام سعید ہے اور میں کافی دیر سے یہاں یہ چیزیں بیچنے آتا ہوں۔ تمہیں تو پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

رحمت نے انگڑائی لی اور زور سے ہاتھ اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا "جی مجھے رحمت کہتے ہیں۔ میں یہاں آج ہی آیا ہوں لیکن میں نے اب

تک تین آنے کما بھی لیے ہیں۔" رحمت نے اپنی جیب میں ہاتھ مارا اور دو سکے اس کی جیب میں کھنکے۔

ایک بڑی سی مرسیڈیس بینز کار ان کے پاس آکر رکی۔ چھوٹا لڑکا چھابڑی اٹھا کر تیزی سے موٹر کی طرف بڑھا اور رحمت کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں کہا۔" میں جا رہا ہوں شاید موٹر میں بیٹھی ہوئی بیگم صاحبہ کچھ خرید لیں"۔

رحمت بھی آگے بڑھا۔ اس نے اپنے دل میں کہا" آج پہلا دن ہے مجھے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہیئے میں ذرا گھوم پھر کر ساری جگہ تو دیکھ لوں۔"

جب ادھر ادھر گھوم رہا تھا تو اسے اپنے پر بہت افسوس ہوا دل میں کہنے لگا۔" میں بھی کیوں ان بچوں کی طرح نہیں ہوں جو اس موٹر میں بیٹھے ہوئے ہیں! وہ میم صاحبہ جو اس دکان میں گئی ہے، اسے کچھ فکر نہیں ہے۔ اس کے پاس تو سب کچھ بہت ہے لیکن ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ایک وقت سے دوسرے وقت ہمیں کچھ کھانے کو ملے گا بھی یا نہیں۔" اس نے ایک چھوٹے سے کنکر کو زور سے ٹھوکر ماری۔" اس چھوٹے لڑکے کو دیکھو۔ میری طرف کتنے غصے میں دیکھ رہا تھا۔ بھلا وہ ہے کیا۔ معمولی چیزیں بیچنے والا۔ شاید وہ ایک دو جماعتیں پڑھا ہوا ہو لیکن پھر کیا ہوا۔ وہ ہے کیا میرے سامنے!"

غصے میں رحمت نے زمین پر زور سے تھوکا۔ اب اس کا غصہ کچھ دھیما ہو چکا تھا۔

آگے بڑھا، تو اسے ایک درزی کی دکان نظر آئی۔ ماسٹر فرشتہ پر

بیٹھا ہوا تھا۔ منہ کی جھریوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کافی عمر ہے۔
"بڑا شریف معلوم ہوتا ہے۔ چلو اس سے ذرا گپ شپ ہی رہے۔"
رحمت یہ سوچ کر آگے بڑھا۔
ایک کھمبے کے پیچھے کھڑے ہو کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ مارا۔ مٹھی بھر کر مرونڈا منہ میں ڈالا۔ اور آگے بڑھا۔
"اسی دم ایک آدمی گندے پانی کی بڑی سی بالٹی ہاتھ میں اٹھائے جلدی سے آگے بڑھا۔ وہ بہت تیزی میں تھا۔ بغیر ادھر اُدھر دیکھے اس نے زور سے بالٹی کا گندا پانی سڑک پر پھینک دیا۔
اُسی وقت رحمت بھی کھمبے کے پیچھے سے نکلا تھا۔ سارے کا سارا گندا پانی اُس کے اوپر گرا۔
رحمت چونک سا گیا اور غصہ میں اُس آدمی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس آدمی نے ذرا پرواہ نہ کی کہ گندے پانی سے رحمت کے کپڑے بالکل خراب ہو گئے ہیں بلکہ اُلٹا رحمت کو ڈانٹتے ہوئے کہا "کھمبے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا! اب آئی ہے نہ نصیحت۔ آئندہ کبھی چوروں کی طرح چھپ کر کھڑا نہ ہوگا۔"
رحمت کو غصہ تو بہت آیا لیکن بچارا بالکل چپ رہا۔ دو چار آدمیوں نے جو اُس کی یہ حالت دیکھی تو زور کا قہقہہ لگایا۔ وہ اپنے کپڑے نچوڑتا آگے بڑھ گیا۔ اپنے دل میں کہہ رہا تھا "شکر ہے گرمی کا موسم ہے کپڑے جلد خشک ہو ہی جائیں گے۔" اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے اس نے کہا۔ "دل کرتا ہے اس کے سارے دانت توڑ دوں یا ایک گندے پانی کی بالٹی اس کے سر پر اُلٹا دوں تو اسے پتہ چل جائے کہ اُس

نے کیا کیا ہے۔ پھر میں اُس پر خوب زور زور سے ہنسوں۔"

اب وہ درزی کی دُکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔"سلام ماسٹر جی۔" وُہ اپنے کپڑے نچوڑتا دُکان کے اندر فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں درزی اُسے گیلے کپڑوں کی وجہ سے باہر نہ نکال دے لیکن درزی نے کچھ نہ کہا۔ وُہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جس پر کئی جھُریاں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن شکل وصُورت سے وہ بڑا رحمدل نظر آتا تھا۔ مہندی لگانے کی وجہ سے اُس کی داڑھی اور سر کے بال سُرخ نظر آرہے تھے۔ اُس نے سر پر سفید پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ وُہ دُبلا پتلا تو ضرور تھا لیکن اُس کی کاٹھی بہت مضبُوط نظر آتی تھی۔

رحمت دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر رکھ کر درزی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔" ماسٹر جی، بہت مصروف نظر آتے ہیں آپ!!"

درزی نے سر ہلایا۔ منہ میں جو سوئیاں دبا رکھی تھیں انہیں قمیض کے بخیہ میں لگاتے ہوئے عینکوں کے اُوپر سے جھانکا اور کہا" ہم جیسے لوگوں کو تو جتنا کام بھی ملے تھوڑا ہے۔ شام تک اتنا کر لیتے ہیں کہ دال روٹی کا گذارہ ہو جائے۔" پھر سُوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ " بیٹا۔ میرا ایک کام تو کرو۔ ذرا دوڑ کر وُہ سامنے چائے والی دکان تک تو جاؤ۔ شاباش۔ میرے لیے ایک پیالہ چائے لے آؤ۔"

رحمت جو کھڑا ہُوا تو درزی نے اس کے بھیگے ہُوئے کپڑے دیکھے "ہیں یہ کیا..... یہ تمہارے کپڑے کیوں گیلے ہیں؟"

غصّہ میں رحمت کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے سارا ماجرا درزی کو سُنایا۔

"ماسٹر جی، کاش وہ آدمی بالٹی کا پانی کسی کوٹ پتلون پہنے ہوئے شخص پر پھینکتا تو وہ اُسے اچھی طرح مزہ چکھاتا۔ مجھ غریب کی طرح اپنا منہ بند نہ رکھتا۔"

درزی نے پگڑی اتار کر تختے پر رکھی اور اپنا سرخ سر ہلاتے ہوئے کہا: "ہائے۔ کتنا ظلم ہے تم پر۔ لیکن چلو چھوڑو۔ بھول جاؤ اس بات کو جب تم میری عمر کو پہنچو گے، تو ایسی ایسی معمولی باتوں پر کبھی بھی دھیان نہیں دو گے۔ اب ناراض ہونے سے کیا فائدہ۔ شاید یہی تمہاری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔"

"ہاں ماسٹر جی، آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں" یہ کہہ کر رحمت کود کر نیچے اترا، "اچھا جناب میں لایا آپ کے لیے چائے۔" تھوڑی دیر میں وہ واپس آگیا۔ اور چائے دیتے ہوئے کہا: "لیجئے ماسٹر جی، یہ رہی آپ کی چائے۔" اچھا اب میں چلتا ہوں۔ شاید کوئی اور کام مل جائے۔

دکانوں کے سامنے بہت سی موٹریں کھڑی تھیں۔ ایک نیلے رنگ کی موٹر میں ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک بھکارن نے شیشے کے سامنے اپنا بچہ کرتے ہوئے کہا: "دے جاؤ کچھ بی بی جی۔ کئی روز سے بچہ بھوکا ہے۔ بیگم صاحبہ خدا کے نام پر کچھ دے دو۔"

بیگم نے نفرت سے دیکھتے ہوئے اپنا بٹوا کھولا۔ ڈھونڈ کر ایک ٹیڈی پیسہ نکالا اور عورت کو دیتے ہوئے کہا: "یہ لے اور دفعہ ہو جا یہاں سے۔"

رحمت کو عجیب سا لگا۔ وہ سوچنے لگا: "سونے چاندی کے زیور خریدتے وقت تو اُسے پیسوں کی کوئی فکر نہ ہوگی۔ لیکن ایک غریب فقیر کو ایک پیسہ بھی دیتے اُسے کتنا دکھ ہوا ہے۔"

پھر اس نے ایک اور فقیرنی کو دیکھا اور اسے دیکھ کر وہ بڑا حیران ہوا مسکراتے ہوئے وہ ایک ریڑھی کو ایک لمبی سفید موٹر کے پاس لے گئی۔ ریڑھی میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کے ہاتھ مڑے ہوئے تھے اور سر بہت ہی بڑا تھا۔ اس آدمی نے عجیب آواز میں اپنا برتن آگے بڑھاتے ہوئے کہا: "اللہ کے نام پر ایک پیسہ"

جو عورت ریڑھی دھکیل رہی تھی اس کا چہرہ بڑا ہی خوفناک تھا۔ منہ پر چوڑی سی ناک تھی۔ وہ بار بار اپنے سر کو جھٹکے دیتی اور اس اپاہج انسان کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کے سر پر سے پھٹا ہوا دوپٹہ سرک گیا۔ اس کے میلے بکھرے ہوئے بال نظر آنے لگے لیکن اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔

موٹر میں بیٹھی ہوئی عورت نے جلدی سے دروازہ بند کر کے شیشہ چڑھا لیا، تو فقیرنی بھی ہنستی ہوئی آگے نکل گئی۔ "نہیں دیتے تو نہ دو" قمیض کی جیب سے اس نے سگریٹ نکالی۔ جلا کر لمبے لمبے کش بھرنے لگی۔ بڑی بڑی آنکھیں نکال کر وہ بار بار ہنستی۔

ایک اور عورت نے اس سے پوچھا "کیا کمائی ہوئی؟" تو وہ بولی "تیرا سر۔ موٹروں والے بڑے کنجوس ہیں" اور ریڑھی کی ہتھی پر زور سے ہاتھ مارا۔

اسی دم کسی نے رحمت کی پیٹھ پر ٹھونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے چھابڑی والا لڑکا کھڑا تھا۔ جس سے صبح اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

"سناؤ یار۔ کچھ اور کمایا؟"

رحمت نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "میرا کام تمہارے کام

کی طرح آسان نہیں ہے۔" پھر اُس فقیرنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" دوست۔ تم اُسے جانتے ہو؟ وہ تو سارا وقت ہنستی رہتی ہے۔ کیا اس کا دماغ خراب ہے؟ یا اس نے پی رکھی ہے؟"

اس لڑکے نے سرگوشی کے لہجے میں رحمت کے کان میں کہا" وہ چرس پیتی ہے۔ چرس۔ تب ہی تو اُسے کچھ ہوش نہیں ہوتی ہے۔"

" سعید اوئے۔" ایک اور لڑکے نے سڑک کے دوسری طرف سے اُسے آواز دی۔

" یہ میرا دوست ہے۔ ہم نزدیک ہی رہتے ہیں اور اکٹھے یہاں کام کرنے آتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر سعید وہاں سے چلا گیا۔

رحمت گہری سوچ میں پڑ گیا۔" کیا چرس پینے سے انسان ہر وقت خوش رہتا ہے!" پھر زور سے سڑک پر تھوکتے ہوئے وہ کام کی تلاش میں دوسری طرف چل دیا۔

اس کی قسمت تیز تھی۔ اُسی وقت ایک موٹر اُس سے چند گز آگے آکر رُکی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور موٹر کو صاف کرنے لگ گیا۔

موٹر میں ایک موٹا سا گنجہ انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ رحمت نے اُس کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا" صاحب بخشیش۔ صاحب بخشیش۔ جناب میں آپ کی موٹر صاف کر دیتا ہوں۔ صرف چار آنے میں صاحب۔"

وہ صاحب موٹر سے باہر آیا اور رحمت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ " لڑکے۔ اپنے گندے کپڑے سے موٹر کو مت خراب کرو۔ موٹر صاف کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔"

"صاحب جی۔ مَیں بہت غریب ہوں۔ مَیں موٹر صاف کردوں گا۔ آپ مجھے بخشیش دے دیں۔"

صاحب نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا: "تم جوان لڑکے ہو کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتے۔" اس نے اپنی جیب سے ایک سکہ نکالا اور رحمت کو دیتے ہوئے کہا: "یہ لو۔ اور کہیں نوکری ڈھونڈو۔"

"صاحب آپ ہی مجھے نوکر رکھ لیں۔"

لیکن صاحب نے بڑی بے صبری سے ہاتھ ہلایا: "کہیں تلاش کرو۔ مل جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ سامنے والی دکان میں چلا گیا۔

چار آنے رحمت نے قمیض کی جیب میں ڈالے۔ اس کے کانوں میں بار بار یہی آواز آئی: "کہیں نوکری کیوں نہیں کر لیتے۔" نہایت مایوسی میں اس نے اپنے دل میں کہا: "کسی کو بھی تو میری رتی بھر پرواہ نہیں ہے۔ کہ میں نوکری کروں یا نہ کروں۔"

اب اُسے تھکان محسوس ہونے لگی۔ مارکیٹ کے بیچ میں بڑا گول چکر تھا اس میں وہ ایک طرف سبز گھاس پر لیٹ گیا۔ دو ایک دفعہ منہ کھول کر اباسیاں لیں اور گہری نیند سو گیا۔ موٹروں کی پوں پوں، بسوں کی گڑگڑاہٹ اور سائیکلوں کی ٹن ٹن، کوئی چیز بھی اس کے آرام میں خلل انداز نہ ہو سکی۔

دو ایک گھنٹے وہ گہری نیند سویا رہا۔ اُسے ایسے معلوم ہوا، جیسے خواب میں کوئی اُسے جھنجھوڑ رہا اور آوازیں دے رہا ہے۔ اُس کی آنکھ کھُلی۔ تو اس کا والد اس کے پاس کھڑا اُسے ہلا رہا تھا۔ "رحمت بیٹا اکثر وقت ہو گیا ہے۔ گھر چلیں۔"

لیکن اس نے "اوں ہوں" کہہ کر دوسری طرف کروٹ بدلی اور بڑبڑاتے

ہوئے بولا "ابا جی، پانچ منٹ اور سونے دو۔ ابھی کہاں صبح ہوئی ہے۔"
اس کے ابّا نے اُسے زور سے ہلایا۔ "اُٹھ پگلے۔ پانچ بجنے والے ہیں
چلو گھر چلیں۔"

رحمت نے جو آنکھیں کھولیں تو اُسے معلوم ہُوا کہ وہ تو ابھی تک مارکیٹ
میں ہی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں ملتے ہوئے بڑے فخر سے کہا۔
"ابّا جی آج میں نے سات آنے کمائے ہیں۔"

باپ نے ہنستے ہوئے کہا "میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ کام کوئی مشکل
نہیں ہے۔ مجھے اپنا ہاتھ پکڑا اور اُٹھ! شاباش۔ اب بیٹھنا نہیں۔"

رحمت ہنستے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ قمیض کی جیب سے سات آنے نکالے۔
اور اپنے ابّا کو دیتے ہوئے کہا "یہ لو ابّا جی۔"

"زندہ باد۔ زندہ باد۔" اس نے زمین پر سے اپنا سائیکل اٹھایا۔
رحمت بیٹے، اس کپڑے میں ساگ بندھا ہُوا ہے۔ اُسے اُٹھالے
گھر لے جانا ہے۔"

رحمت کا ابّا سائیکل پر سوار ہوگیا اور جب سائیکل تیز چلنے لگی تو
رحمت اُچھل کر پیچھے بیٹھ گیا۔ دل میں کہہ رہا تھا "اب ہم گھر جا رہے ہیں۔
گھر تو دُنیا میں سب سے پیاری چیز ہے۔"

پیچھے بیٹھے ہوئے اُونچی آواز میں اس نے ابّا کو سارے دن میں جو جو
کچھ ہُوا، وہ سُنایا۔ کسی بات پر ابّا ہنس دیتا یا کبھی کبھی سر ہلا کر کہہ دیتا
"شاباش بیٹے، یہ بہت اچھا تھا۔"

جب وہ نہر کے پُل پر سے گزرے تو وہاں تو نظارہ ہی کچھ اور تھا۔
بھینسیں پانی میں لیٹی ہوئی تھیں۔ کچھ بچے پُل پر سے پانی میں چھلانگیں لگا

رہے تھے اور کچھ نہا رہے تھے۔ دو چار بچے ایک ٹیوب کے سہارے تیر رہے تھے۔

جب رحمت کے ابا نے یہ نظارہ دیکھا تو اس نے اپنی سائیکل ٹھہرائی "آؤ رحمت، یہاں تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ میں بہت تھک گیا ہوں تم بے شک نہا لو۔ مزہ آجائے گا۔ آج تم نے بھی بہت کام کیا ہے۔" باپ نے بیٹے کی کمر پہ ہاتھ مار کر شاباش دیتے ہوئے کہا۔

"جی ابا جی۔ واقعی تھک گیا ہوں۔" لڑکے نے جلدی جلدی کپڑے اتارے۔ پانی میں ایک زور دار "غڑاپ" کی آواز آئی اور اس جگہ پانی میں بلبلے اٹھنے لگے جہاں رحمت نے چھلانگ لگائی تھی۔ رحمت اب پانی میں تیر رہا تھا۔ وہ اس طرف نکل گیا جہاں بہت سی بھینسیں پانی میں لیٹی ہوئی تھیں وہ ایک بھینس کی کمر پہ چڑھ گیا اور اپنے کان میں انگلی ڈال کر پانی نکالنے لگا۔

باپ یہ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کہ رحمت پانی میں کتنا خوش ہے۔ پھر رحمت نے زور زور سے پانی میں پیر مار مار کر پانی اچھالنا شروع کیا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے آواز دی "ابا جی، آپ بھی آجائیں پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ ماریں چھلانگ۔"

"نہیں بھائی نہیں۔ اگر میں ڈوب گیا تو پھر تمہیں اکیلے ہی سارے گھر کے لیے پیسے کمانے ہوں گے۔ مجھے رہنے ہی دو۔"

رحمت نے ہنستے ہوئے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور دل میں کہا۔ "میرا باپ مجھے تیرتے دیکھ کر کتنا خوش ہو رہا ہے۔ مارکیٹ میں اکیلے گھومنے سے تو یہاں کتنا اچھا ہے۔"

اب وہ بھینس کی پیٹھ پر کھڑا ہو گیا اور زور سے پکار کر کہا "ابا جی، میں آرہا ہوں"۔ اور زور سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کنارے پر آ لگا۔ جب اُس نے اپنا مُنہ اوپر اُٹھایا تو پانی اُس کے بالوں اور مُنہ پر سے ٹپک رہا تھا۔ باپ نے اُسے دیکھتے ہُوئے کہا "بس بیٹے نہا چکے! جی بھر گیا!"

رحمت کنارے پر چڑھ چکا تھا باپ نے اُس کی دھوتی اُس کی طرف پھینکی جسے اُس نے جھپٹ کر پکڑ لیا۔ باپ اُس کے توانا و تندرست بدن کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ رحمت نے دھوتی باندھی، قمیض پہنی اور زمین پر سے سائیکل اُٹھا کر کہنے لگا۔ "چلو ابا جی، چلیں مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"چلو چلیں۔ بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔"

باپ سائیکل چلانے لگا اور رحمت پھر پیچھے بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد شاہ جمال پہنچ گئے۔ اب وہ اپنے محلہ میں داخل ہوئے۔ رحمت کو ان گلیوں سے کتنا اُنس تھا۔ اسے یہ آج ہی معلوم ہُوا کیونکہ وہ سارا دن باہر رہا تھا۔ جا بجا گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کئی گھروں کے سامنے بھیڑ بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچھ تو گھاس کھا رہی تھیں۔ اب وہ اپنے گھر کی گلی میں مڑے۔ دونوں سائیکل سے نیچے اُتر گئے۔

"اُف۔ تیرنے کے بعد تو میں سخت تھک گیا ہوں" رحمت نے لمبا سا مُنہ بناتے ہُوئے کہا۔ جس پر اُس کا باپ ہنس پڑا۔

"چل اوچل۔ ذرا سی دیر نہانے میں اتنا تھک گیا ہے۔ ابھی تو خیر سے جوان لڑکا ہے۔"

اب انہیں گھر کا کھلا ہوا دروازہ نظر آیا۔ چھوٹا فلپ بالکل ننگا زمین پر بیٹھا زور زور سے رو رہا تھا۔ ماں کی تیز آواز آئی "بشیرہ اس شیطان کو اٹھاتی کیوں نہیں؟"

بشیرہ دوڑتی ہوئی گئی۔ ہاتھ پھیلا کر اُسے کہنے لگی "اوئے اوئے اوئے۔ کیا ہوگیا میرے ویر کو۔ اوئے اوئے اوئے۔"

چھوٹا سخت بگڑا ہوا تھا۔ اُس نے تڑاخ سے بشیرہ کو ایک تھپڑ رسید کیا۔

اُسی لمحے بشیرہ نے اپنے بھائی اور باپ کو گھر آتے دیکھا۔ اُس نے جھٹ فلپ کو گود میں لیا اور بھاگتی ہوئی ماں کے پاس جا کر کہنے لگی "امّی جان، وہ آرہے ہیں۔ امّی جی۔ وہ آرہے ہیں۔"

"کیا کہا؟ کون آرہے ہیں؟" ماں نے جلدی سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا اُسی وقت رحمت اور اس کا ابّا صحن میں داخل ہوئے۔

ماں نے اپنا دوپٹہ درست کیا۔ ہاتھ بڑھا کر فلپ کو تھاما اور بشیرہ کو کہا "چل بشیرہ جلدی کر۔ الماری میں سے پیالے اتار" اور وہ اُن دونوں کی طرف بڑھی۔

"میرے بیٹے۔ دن کیسا گذرا؟"

رحمت نے سر ہلا کر کہا "اماں جی، وقت اچھا ہی گزر گیا لیکن اِس وقت تو بڑی بھوک لگی ہوئی ہے۔"

"چلو ابھی تو چائے پی لو" ماں نے پیار سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہی ہے، میں کبھی گھر میں نہیں تھی۔ ابھی ترکاری نہیں بنی۔ میں ابھی روٹیاں ڈالتی ہوں۔"

رحمت کے ابّا نے سائیکل کو کونے میں دیوار کے سہارے کھڑا کیا۔ آہستہ آہستہ واپس آیا اور رحمت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فخر سے کہا "آج شیر بچے نے سات آنے کمائے ہیں۔ اب بولو ننھے کی ماں !!!"

ماں نے بیٹے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ شاباش میرے لال۔"

باپ اور بیٹا چارپائی پر بیٹھ گئے، تو ماں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پکارا۔" بشیرہ۔ کہاں چلی گئی؟ ابھی تک اپنے ابّا اور بھائی کے لیے چائے نہیں لائی۔"

بشیرہ نے بھی اونچی آواز میں کہا" لائی ماں جی۔" وہ اپنے بھائی کے بارے میں سوچ سوچ کر خوش ہو رہی تھی۔ اُسے معلوم ہی نہ ہُوا کہ کب چائے کے پیالے لبالب بھر گئے۔ اور پرچوں میں بھی چائے بھر گئی تھی۔

"ہائے ہائے بدتمیز۔ لا اِدھر دے مجھے پیالے۔ کتنے بھر دیئے ہیں" ماں نے دونوں پیالے لے لیے اور اپنے خاوند اور رحمت کو تھماتے ہوئے خود بھی بیٹے کے نزدیک چارپائی پر بیٹھ گئی اور سارے دن کی سرگذشت سننے لگی۔

محمود نے سر ہلایا اور کہا "ہاں ٹھیک ہے لیکن ہمارا کام تو چلتا رہتا ہے۔ جنہوں نے سگریٹ خریدنی ہوتی ہے وہ گرمی کی پرواہ نہیں کرتے اور پھر مزدور تو ضرور ہی سگریٹ پیتے ہیں تاکہ چست رہیں اور خوب کام کر سکیں۔

اب رحمت سگریٹ والے کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہا تھا، کیونکہ اس نے دور سے غلام کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا "میاں جی، وہ غلام آ رہا ہے۔" اور اپنا کپڑا زور زور سے ہلاتے ہوئے پکارا "تم کتابیں تو ساتھ لائے ہو نا، غلام۔"

غلام نے کتابیں ہوا میں لہراتے ہوئے بلند آواز میں جواب دیا۔ "لایا ہوں، رحمت۔ یہ دیکھو....."

غلام نے اپنے باپ کی طرح قمیض پہن رکھی تھی۔ اور اسی رنگ کی دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ قد میں وہ رحمت کے کندھے تک ہی پہنچتا تھا لیکن وہ بڑا تندرست و توانا تھا۔ اس کی گول گول آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔ اگر کوئی نقص تھا تو صرف یہ تھا کہ اس کے ہونٹ بڑے موٹے موٹے تھے۔

غلام کے باپ نے دیوار کا سہارا لیا اور حقہ اپنی طرف کر کے کش لگایا۔ پھر غلام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑے اچھے وقت پر آئے ہو بیٹا۔ چلو یہاں ہی بیٹھ جاؤ اور کل والی کہانی پڑھو۔ میں بھی وہ کہانی سننا چاہتا ہوں۔"

دونوں لڑکوں نے مایوسی میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کا ایک ہی خیال تھا کہ بچے بڑوں کی مجلس میں نہیں بیٹھتے۔ رحمت اپنے

پاؤں کی انگلیوں کی طرف دیکھ دیکھ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔
غلام نے کتابوں کو اپنی ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہا "ابا جی.... دراصل
.... ابا جی..... ہم تو اس درخت کے نیچے لیٹ کر کتاب پڑھیں گے
یہاں تو بڑی گرمی ہے وہاں بڑی مزیدار چھاؤں ہے۔"
باپ نے حقے کا کش لگایا اور ڈانٹ کر کہا "جاؤ دفع ہو جاؤ
یہاں سے۔ چلو وہاں ہی جا کر پڑھو۔"
دونوں لڑکے تیزی سے اس کونے کی طرف دوڑے۔ ذرا دور غلام
نے رحمت کی قمیض کھینچتے ہوئے کہا "ذرا رکو تو رحمت۔ دیکھو میں تمہیں
ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔"
"یار، میرا تو خیال تھا کہ تمہارا باپ ہمیں ملنے ہی نہیں دے گا" رحمت
نے ہانپتے ہوئے کہا۔
"کچھ معاملہ تو ایسا ہی تھا۔" اس نے اپنی جیب سے ایک چیز نکالی
جو کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی۔ "بوجھو یہ کیا ہے؟"
رحمت نے کندھے جھٹکائے اور کہا "سگریٹ معلوم ہوتی ہے۔"
"کیا تم نے کبھی اس کا مزہ لیا ہے؟"
"رحمت نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا "نہیں۔ میں نے تو اسے آج تک
ہاتھ نہیں لگایا۔"
"تو چلو آج مزہ چکھ ہی لو۔" غلام نے آہستہ سے اس کے کان میں
کہا۔ "لیکن یہاں نہیں۔ بڑے میاں ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ سامنے والی گلی
میں گھس جاتے ہیں۔ وہاں آزادی سے پئیں گے۔"
دونوں ایک ساتھ دوڑے۔ گلی میں جب غلام نے سگریٹ منہ میں

دبا کر ماچس جلائی تو رحمت "کھی کھی کھی" کر کے ہنسنے لگا۔ غلام بالکل بڑے آدمیوں کی طرح سگریٹ جلا رہا تھا۔ اس نے ایک گہرا کش لگایا اور ڈھیر سا دھواں ہوا میں چھوڑا۔

یہ دیکھ کر رحمت زور زور سے ہنسنے لگا۔ "رحمت، بڑا مزہ ہے اس میں" وہ ذرا سا کھانستے ہوئے بولا۔

"یار اس کا مزہ کیسا ہے؟" رحمت نے منہ آگے کر کے پوچھا۔ "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم رونے والے ہو۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔"

"چپ اوئے کھوتے" غلام نے ہاتھ سے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اگر تم اسی طرح ہنستے اور شور کرتے رہے تو لوگ کیا خیال کریں گے؟"

اس نے ایک اور کش لگایا۔ زور سے کھانس کر بہت سا تھوک زمین پر گرایا اور رحمت سے کہا۔ "یار بڑا مزہ آ رہا ہے۔ اب تمہاری باری ہے۔ لو۔ پیو۔"

رحمت کو کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا کرے۔ اس نے کچھ جھجک کے ساتھ سگریٹ کو ہونٹوں میں دبایا اور ہلکا سا کش لگایا۔

غلام یہ دیکھ کر بڑا مایوس ہوا۔ "گدھے۔ بھلا اس طرح سگریٹ پیتے ہیں؟"

دراصل وہ رحمت کو بھی اس جرم میں شریک کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کا آئندہ مذاق نہ اڑائے کہ سگریٹ سے اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اس نے ٹھیک طرح سے سگریٹ اس کے ہونٹوں میں لگائی اور اسے حکم دیا۔ اب زور سے اندر سانس کھینچو۔"

جونہی دھواں رحمت کے گلے میں لگا وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ اور اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ غلام کو بڑا مزہ آیا۔ زور سے ہنسنے لگا اور بولا "کیوں یار، آیا نہ مزہ۔ کتنی ذائقہ دار ہے یہ چیز!"

رحمت نے سگریٹ کا باقی حصہ دور پھینک دیا۔ "مزہ!!! توبہ کرو۔" منہ کا کڑوہ پن دور کرنے کے لیے وہ بار بار تھوک رہا تھا۔

دونوں کے سر چکرا رہے تھے لیکن ماننے کو کوئی بھی تیار نہ تھا۔

"چلو اب چلیں اور کل والی کہانی شروع کریں۔" دونوں گلی سے باہر آئے۔ رحمت تو سڑک پار کرنے لگا لیکن غلام دوسری طرف مڑ گیا یہ دیکھ کر رحمت نے آواز دی "غلام کہاں جا رہے ہو؟ کہانی نہیں ختم کرنی؟"

"دوست ابھی آیا۔ ذرا پانی پی لوں۔ پیاس لگ رہی ہے۔"

رحمت بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ دونوں نے نلکے سے منہ لگا کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا۔ ہتھیلی سے منہ پونچھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔ اب سر چکرانا بند ہو چکا تھا۔ وہ دونوں اپنی خاص جگہ پر آ بیٹھے اور جلد ہی پریوں کی دنیا میں کھو گئے۔ غلام تین شہزادوں والی کہانی پڑھ رہا تھا۔ رحمت کے دل میں بار بار یہی خیال آتا "کاش میں بھی پڑھ سکتا۔ کیا میں اب بھی سکول میں داخل ہو سکتا ہوں؟ کیا میں بھی پڑھنا سیکھ سکتا ہوں؟"

کچھ دیر بعد غلام نے زور سے کتاب بند کی اور کہا "آج یہاں تک ہی کافی ہے۔ میرا منہ سوکھ رہا ہے۔ میں زیادہ نہیں پڑھ سکتا۔ چلو اب کشتی ہو جائے۔"

رحمت میں ایک دم چستی آگئی۔ وہ کود کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے کہا "آج تمہیں خوب پٹخنیاں دوں گا۔ اور اپنے دائیں ہاتھ کے ڈولے پھلاتے ہوئے کہا "یہ دیکھو غلام"۔

اسی لمحے دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ کبھی غلام اوپر ہوتا اور کبھی رحمت اسے اڑنگا مار کر گرا دیتا۔ لیکن رحمت غلام سے زیادہ طاقت ور تھا۔ جلد ہی اسے نیچے گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور زور زور سے ہنسنے لگا اور کہا "چلو کشتی ختم"۔

غلام ہانپتے ہوئے گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی شکست پر قدرے ناراض تھا لیکن رحمت نے اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا "غلام ذرا سی مشق سے تم بہت اچھا لڑ سکتے ہو۔ پہلے میں بھی نہیں لڑ سکتا تھا۔ لیکن میرے ایک دوست طارق نے مجھے کشتی لڑنی سکھائی ہے۔ اور اب میں کسی سے نہیں ہارتا۔ اگر تم چاہو تو ہم روزانہ مشق کریں گے۔ میں تمہیں داؤ پیچ سکھاؤں گا اور پھر تم بھی میری طرح پہلوان بن جاؤ گے"۔

رحمت کو اچانک اس بات کا احساس ہوا کہ خاصہ دن گذر چکا ہے اور اس نے اب تک کچھ بھی نہیں کمایا۔ وہ کود کر کھڑا ہو گیا۔ اور سڑک پر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ غلام نے بھی کتابیں سنبھالیں، کپڑے جھاڑے اور کہا۔ "رحمت ہم روز دوپہر کو کشتی لڑا کریں گے"۔

رحمت نے دور سے ایک لال موٹر آتے دیکھی۔ یہ وہی موٹر تھی جسے اس نے چار دن پہلے صاف کیا تھا۔ موٹر کا مالک بڑا سخی دل تھا۔ اس نے رحمت کو ایک روپیہ دیا تھا۔ رحمت موٹر دیکھتے ہی اس طرف لپکا

لیکن نامعلوم کہاں سے ایک اور لڑکا بھی جو رحمت سے کافی بڑا تھا۔ اُسی موٹو کی طرف بھاگا۔ جب اُس نے رحمت کو وہاں آتے دیکھا تو غصّہ میں آنکھیں نکالتے ہوئے اس سے کہا "اوئے بھنگی کے بچّے۔ دفعہ ہو جا یہاں سے۔"

رحمت کو تو آگ لگ گئی۔ اُس نے لڑکے کو گردن سے پکڑ کر کہا "کیا بکواس کی تو نے ذلیل انسان۔ تیرا کیا خیال ہے۔ کیا سارے عیسائی بھنگی ہوتے ہیں؟ دانت توڑ دوں گا تیرے۔"

جونہی رحمت نے اس کے مُنہ پر مُکّا مارنے کو ہاتھ اٹھایا تو غلام جو سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ تیزی سے آیا اور اُس کے ہاتھ کو پکڑ کر اُسے کھینچتے ہوئے کہا "رحمت۔ کس کمینے کے مُنہ لگ رہے ہو۔ وُہ تو ہے ہی ذلیل۔"

غلام اُسے گھسیٹتا ہُوا دوسری طرف لے گیا۔ لیکن رحمت اب بھی اس لڑکے کی طرف گھُوم گھُوم کر دیکھ رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا "گندے نیچ پاجی۔ تیری تو ہڈیاں ہی توڑ کر مجھے چین آئے گا۔"

غلام نے باتوں کا رُخ پلٹتے ہوئے کہا "رحمت وہ دیکھو۔ ان پتنگوں کے پیچ ہو رہے ہیں۔ اور وُہ دیکھو! کالی پتنگ کٹ گئی ہے۔"

دونوں دوسری لال پتنگ کو دیکھ رہے تھے۔ جو کالی پتنگ کو کاٹ کر اب اُوپر اٹھ رہی تھی۔ لیکن آج رحمت کو پتنگ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لڑکے کی بات اب بھی اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اسے اب بھی سخت غصّہ آ رہا تھا۔

دو چار منٹ تو وہ پتنگ کی طرف دیکھتے رہے لیکن اُسی لمحے غلام کے

والد نے اُسے آواز دی۔" بیٹا جلدی ادھر آؤ۔ تم یہاں دُکان میں بیٹھو میں ابھی آیا۔"

رحمت کچھ دیر اُسی جگہ کھڑا رہا۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ وہ بھی غلام کے ساتھ ہی جائے، لیکن پھر ارادہ بدل لیا۔ اور درزی کی دکان کی طرف چل دیا۔ کیونکہ وہاں اُسے بڑا سکون ملتا تھا۔ اس نے غلام سے کہا "اچھا دوست کل ملیں گے۔"

جب وہ درزی کی دکان کی طرف جا رہا تھا تو اس نے بہت سے لوگوں کو مسجد کی طرف جاتے دیکھا۔ کچھ آدمی تو مسجد میں پہنچ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ رحمت نے دل میں کہا "شکر ہے۔ وقت ہو گیا ہے اب تو ابّا بھی آنے ہی والے ہوں گے۔" نا معلوم آج کیوں اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ جلدی جلدی اپنے گھر پہنچ جائے۔ وہ آہستہ آہستہ درزی کی دکان کی طرف بڑھا۔ وہاں پہنچ کر اُسے سخت مایوسی ہوئی۔ درزی دُکان میں موجود نہیں تھا۔ بھلا ماسٹر جی کہاں جا سکتے ہیں؟" اُسے ایک دم یاد آیا کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے۔" ضرور ماسٹر جی نماز پڑھنے گئے ہوں گے۔"

رحمت نے گول چکر کی طرف نظر دوڑائی۔ وہاں گھاس پر ماسٹر جی نماز پڑھ رہے تھے۔ اُس نے دل میں کہا" میں انتظار کرتا ہوں۔ ماسٹر جی پانچ منٹ میں آجائیں گے۔" وہ دکان کے اندر چلا گیا اور دیوار سے پیٹھ لگا کر آرام سے نیچے بیٹھ گیا۔

بیٹھ کر اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک طرف سلائی کی مشین تھی اور دوسری طرف ایک اینٹ کے اوپر گرم استری پڑی تھی۔ یہی ماسٹر جی کے کام کے بڑے اوزار تھے۔

رحمت سوچ رہا تھا۔ "درزی کی ہر چیز کتنی پرانی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔ کبھی بڑبڑاتا نہیں۔ کیا بوڑھے لوگ ہمیشہ مطمئن ہوتے ہیں؟ لیکن اور بھی تو بہت سے بوڑھے ہیں جو ہمیشہ لڑتے جھگڑتے اور بڑبڑاتے رہتے ہیں، اور نوجوانوں سے بھی زیادہ جھگڑالو ہوتے ہیں۔ رحمت بیسیوں مرتبہ اس کے لیے چائے لا چکا تھا اور اکثر ماسٹر اُسے بھی ایک پیالہ چائے دے دیتا تھا۔ اب تو جب بھی وہ ناراض ہوتا تو ماسٹر ایک دم سمجھ جاتا تھا کہ رحمت کے ساتھ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔ اُسے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ رحمت نے سر اُٹھا کر دیکھا ماسٹر جی واپس آ رہے تھے۔ اُسے دیکھتے ہی ماسٹر جی نے مسکرا کر کہا "سناؤ رحمت بابو، کیا حال ہے! اب تو تمہارے ابا بھی آنے ہی والے ہیں۔"

گہری سانس لیتے ہوئے درزی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور مشین اپنے نزدیک کھسکائی۔

"بیٹے اب میں کافی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ جوڑوں میں درد رہتا ہے۔ ذرا حقہ تو میرے نزدیک کرنا۔"

رحمت کونے سے اٹھ کر آگے آیا۔ حقہ نزدیک کر کے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ "ماسٹر جی آپ کا سوئیوں کا ڈبہ الٹ گیا ہے۔ ساری سوئیاں بکھری پڑی ہیں۔" اس نے ساری چیزیں سمیٹیں اور انہیں جھاڑ کر ڈبے میں ڈالا۔ اور ڈبہ ماسٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے ساری چیزیں ڈال دی ہیں۔ دیکھ لیں۔"

"اچھا تو یہ بات تھی۔ میں بھی ساری دوپہر حیران تھا کہ ڈبہ کیوں خالی ہے اور ساری سوئیاں کہاں گئیں۔"

رحمت دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھا اور پوچھنے لگا "ماسٹر جی، ڈبہ لڑھکنے کا شور آپ نے نہیں سُنا تھا؟"

"دراصل دوپہر کو میں ذرا اُونگھ گیا تھا۔ مَیں نے پیر سیدھے کئے تھے۔ شاید اسی وقت ڈبہ پلٹ گیا ہوگا" حُقّہ کا کش لگاتے ہوئے درزی نے کہا "ہاں بیٹا رحمت۔ وہ ابھی ابھی کیا بات ہوگئی تھی؟ مَیں تمہیں دیکھ رہا تھا کہ تم ایک بڑے لڑکے سے لڑ رہے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہُوا کہ وجہ کیا تھی!"

رحمت نے درزی کو ساری بات بتائی۔ غصّہ میں اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

درزی نے ساری بات سُن کر سر ہلایا اور رحمت سے کہا "بیٹا۔ اگر تم میری صلاح مانو تو مَیں تو یہی کہوں گا کہ تم ضرور کچھ لکھ پڑھ لو اور کسی اچھی جگہ نوکری تلاش کرو۔ تب تم میں خود اعتمادی پیدا ہو جائے گی۔ تب اگر کوئی تمہیں چُوڑھا کہے یا کوئی اور بُرا نام دے تو تمہیں غصّہ نہیں آئے گا۔ اور جب تم اچھی طرح ملازمت کر لوگے تو میرا یقین ہے کہ کوئی تمہیں ایسا کہہ ہی نہیں سکے گا۔"

رحمت بہت حیران ہُوا لیکن بابا جی۔ اگر ایسی گندی بات کبھی بھی کسی نے مجھے کہی تو مَیں تو یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے، بیٹا۔" درزی نے بڑی دھیمی آواز میں کہا "تم بالکل اَن پڑھ ہو اور اس لیے اپنے کو بہت نیچ خیال کرتے ہو اور اپنے کو کسی کام کے لائق نہیں سمجھتے ہو۔"

رحمت نے قمیض کی آستین سے اپنے مُنہ پر سے پسینہ پونچھا اور کہا۔ "ماسٹر جی، شاید آپ محسوس ہی نہیں کر سکتے کہ اگر کسی کو مہتر کہا جائے جبکہ وہ نہ ہو تو اُسے کتنا بُرا لگتا ہے۔ کسی اور مذہب کے بچّے کو کیوں مہتر نہیں کہا

جاتا۔ صرف ہمیں ہی کیوں اس ذلیل نام سے پکارا جاتا ہے؟"

درزی نے کپڑا نیچے رکھ دیا۔ حُقّہ کی نالی ہاتھ میں پکڑ کر دو چار گہرے کش لگائے اور خاموشی سے رحمت کو دیکھتا رہا۔ آخر ذرا دیر بعد رحمت سے پُوچھا "بیٹا۔ تم اپنے کو مسیحی کہتے ہو۔ مجھے بتاؤ تم اپنے مذہب کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ کیا تم کبھی اپنے گرجے جاتے ہو؟ کیا تم خُدا سے دُعا مانگتے ہو؟ دیکھو میں مسلمان ہوں۔ میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں۔ قرآن پڑھتا ہوں۔ روزے رکھتا ہوں۔ خیرات دیتا ہوں۔ تم لوگ کیا کرتے ہو؟"

اس سے پدرانہ لہجے میں پُوچھا۔

رحمت نے کپڑے کو اپنے ہاتھوں میں مچوڑتے ہُوئے کہا: "ہُوں..... بات یہ ہے بابا جی، کہ میں ایک مسیحی خاندان میں پیدا ہوا۔ میرے والدین مسیحی ہیں اس لیے میں بھی مسیحی ہوں اور میرے ابّا نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ جب ہم مریں گے تو آسمان پر جائیں گے۔"

اب تو بوڑھا درزی بڑا ہی حیران ہُوا اور کہنے لگا: "واہ۔ آسمان پر جانے کا تو یہ بڑا ہی آسان راستہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا واقعی یہ اتنا آسان ہے؟"

رحمت نے رُکتے رُکتے کہا: "بس بابا جی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ مجھے تو اچھی طرح معلوم نہیں۔"

رحمت دل میں یہ خواہش کر رہا تھا کہ اس کا ابّا جلدی سے آجائے اور اُسے اِس مشکل بات سے رہائی ملے۔ وہ بار بار باہر کی طرف دیکھتا۔

عین اُسی وقت دُور سے اُسے اپنا ابّا آتا نظر آیا وہ زور زور سے پیڈل گھما رہا تھا۔

رحمت جھٹ اٹھ کھڑا ہُوا اور "ابّا جی، ابّا جی" کہتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگا۔

آیا ابا جی۔"

"اچھا ماسٹر جی، اب میں چلتا ہوں۔ میں مزدور لکھتے پڑھنے والی بات مانوں گا اور کوشش کروں گا۔"

درزی نے حقہ ایک طرف کیا۔ کٹی ہوئی قمیض تھامی اور مشین پر اُسے سینے لگا اس کا خیال رحمت کی طرف ہی تھا۔ "یہ لڑکا تو بالکل جاہل ہے۔ اس کے ماں باپ اُسے اپنے مذہب کی کیوں تعلیم نہیں دیتے، میرے بچے کو ہی لو۔ جب وہ چھوٹا سا ہی تھا تو میں نے اُسے قرآن حفظ کرایا۔ نماز سکھائی اور ہر جمعہ کو اُسے مسجد میں لے جاتا ہوں لیکن اس کی بات سنو! اُسے صرف یہ معلوم ہے کہ "میرے ماں باپ مسیحی ہیں اس لیے میں مسیحی ہوں۔ واہ کیا کہنے ماں کے اس لعل کے!!!"

چوتھا باب

گھر میں رحمت کی ماں نے چائے تیار کی ہوئی تھی۔ "آپ دونوں کو آج دیر کیوں ہوگئی؟" اس نے پیالوں میں چائے ڈالتے ہوئے پوچھا۔

صحن میں باپ اور بیٹا ایک چارپائی پر پاؤں اونچے کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ باپ نے اپنے پاؤں کے پنجے کو سہلاتے ہوئے کہا "اف آج نا معلوم کس منحوس کا منہ دیکھا تھا۔ آج بڑی خراب جگہ مزدوری ملی! ایک صاحب مجھے زمین کھودنے لے گئے وہ کوٹھی گلبرگ سے کافی دور ہے۔ توبہ! کوٹھی کا مالک تو پورا جلاد تھا۔ سارا دن مجھ پر حکم چلاتا رہا اور یہی کہتا رہا۔ تمہیں تو کسی پکڑنی بھی نہیں آتی..... غصہ میں مجھ سے بھی کام نہیں ہوتا تھا اور کچھ سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

"تو وہ ذلیل چاہتا کیا تھا؟" رحمت کی ماں نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "بھلا کیا آپ زمین نہیں کھود سکتے؟"

پھر رحمت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میرے لعل۔ آج تم کیوں اتنے چپ چپ ہو؟" دونوں کو چائے کے پیالے دیتے ہوئے وہ بھی چارپائی

پر بیٹھ گئی۔

"میرے بیٹے جب سے تم گھر آئے ہو تم نے ایک بات بھی نہیں کی!" پھر رحمت کی کمر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا "کچھ اپنی امّی کو بھی تو بتاؤ۔ کیا ہُوا؟"

اب تو باپ کو بھی محسوس ہُوا کہ رحمت کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ اُس نے پیالہ نیچے رکھتے ہُوئے رحمت کی بغل میں گدگدی کرتے ہوئے کہا۔ "پہلوان جی، کچھ بولو بھی۔"

نہ کریں ابّا جی۔ چائے گر جائے گی۔" رحمت کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"ہیں!!! کیا بات ہوئی بیٹا! کیا کسی سے لڑائی ہو گئی!!!؟ میں مان تو نہیں سکتا کہ کوئی تمہیں مار سکتا ہے۔ پھر بھی کیا ہُوا تمہیں؟" اس کے باپ نے بے صبری سے پُوچھا۔ "بتاؤ تو سہی۔"

خالی پیالے کی طرف گھورتے ہُوئے رحمت نے رُندھی ہُوئی آواز میں کہا۔ ہُوا تو کچھ نہیں لیکن ابّا جی، آپ کو کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں۔"

"باپ نے ہنس کر کہا۔" جو کچھ ہُوا اُسے بتانا شروع کر دو تو ساری بات بتا سکو گے۔ بس شروع کرنے کی دیر ہے۔"

رحمت نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا۔" مسیحی ایمان کے بارے میں کچھ خیالات ہیں جو مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ آج میں اسی درزی کے پاس بیٹھا ہُوا تھا جس کے بارے میں اکثر آپ سے ذکر کرتا رہتا ہوں۔ آج اس نے مجھ سے پُوچھا کہ تم مسیحیوں کا ایمان کیا ہے اور تم....."

ابّا ایک دم بول اٹھا۔" تو اس میں فکر مند ہونے کی کیا بات ہے؟ یہ بھی بھلا کوئی مشکل بات ہے۔ اُسے تم بتا دیتے کہ ہم خُدا پر ایمان رکھتے

ہیں اور مسیح پر جو اس کا بیٹا ہے۔ بس یہی ہمارا ایمان ہے اور کیا!!!" دراصل وہ اب خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر رحمت نے اور سوال کرنے شروع کر دیئے تو اسے تو خود بھی کچھ معلوم نہیں ہے وہ بھلا اسے کیا جواب دے گا۔

رحمت نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔" اپنے مذہب کے بارے میں اتنا تو میں ضرور جانتا ہوں۔ لیکن کیا اتنا ہی جاننا کافی ہے؟ آج جب ورزی مجھ سے سوال کر رہا تھا تو میں بے وقوفوں کی مانند اس کے سامنے کوئی جواب نہ دے سکا۔ مجھے اپنے دل میں احساس ہُوا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ ہرگز ہرگز کافی نہیں ہے۔

باپ نے اپنی مونچھ کو انگلیوں میں مروڑتے ہوئے دل میں کہا۔" میں اس جوان کو کیا بتاؤں! میں جب خود رحمت کی عمر کا تھا تو ایک دفعہ مجھ سے بھی کسی نے ایسے ہی سوالات پوچھے تھے۔ اور میرے باپ نے تو بس یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ مذہب کے بارے میں بالکل نہ سوچا کرو۔"

"رحمت اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں ایسے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیتا اور نہ ہی فکرمند ہوتا۔ یہ تو بالکل چھوٹی اور معمولی باتیں ہیں۔ بس ہم تو یہی جانتے ہیں کہ ہم مسیحی ہیں۔ خدا بڑا مہربان ہے۔ جب ہم اس دنیا سے کوچ کر جائیں گے تو وہ ہمارے گناہ معاف کر دے گا اور ہم آسمان پر جائیں گے۔"

"یہ تو میں سب کچھ جانتا ہوں"۔ لڑکے نے جواب دیا۔" لیکن کیا دعا کرنے کی ضرورت نہیں ہے! کیا ہمیں خیرات نہیں کرنی چاہیئے! کیا ہمیں اس کے متعلق پوری تسلی نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم جنت میں جائیں گے، یا نہیں!"

اِس پر باپ ذرا اُونچی آواز میں بولا۔" ہمیں اِس قسم کی باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی ہمیں جنّت میں اپنے لیے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے بیٹے، میری بات سُن۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ اتوار کو مجھے آرام کرنے کا ایک دِن مِلتا ہے۔ بھلا اُس دِن گرجے جاکر سارا دن ضائع کرنے میں کون سی تُک ہے۔ ایک مزدور سے جو چھ دِن تو گدھے کی طرح کام کرتا ہے۔ آرام والے دِن کون یہ توقع کریگا کہ وہ گرجے جائے۔ رٹّی ہوئی دعائیں دہرائے اور وعظ کے وقت سو جائے نہیں، نہیں، میں تو کبھی بھی اس طرح اپنے آرام کے دِن کو خراب نہیں کروں گا۔"

اس کے بعد یہ گفتگو ایک دم ختم ہوگئی۔ باپ اٹھا۔ حُقّہ لے کر نلکے کی طرف گیا کہ اُسے تازہ کرے۔

ماں نے بھی بڑی خاموشی سے ساری گفتگو سنی۔ جو کچھ اُس نے سُنا اس کا اُسے یقین نہ آتا تھا۔ نامعلوم آج کل اس کے بیٹے کو ایسے خیال کیوں ستا رہے تھے۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے بیٹے سے کہا "پیالہ اِدھر کرو میں اور چائے دُوں"۔ پیالے میں چائے ڈالی اور کہا "بیٹے تم مدّت سے طارق کے گھر نہیں گئے ہو۔ چائے پی کر وہاں چلے جاؤ۔ تمہارا دِل بہل جائے گا۔"

"ارے ہاں۔ آپ نے مجھے ایک بڑی اچھی بات یاد دلا دی"! جلدی جلدی اُس نے چائے ختم کی، چار پائی کے کنارے بیٹھ کر چپلی پہنی اور باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" ابا جی کیا خیال ہے آپ کا! کیا طارق مجھے لکھنا پڑھنا سکھا دے گا؟"

رحمت کی ماں اور بھی حیران ہوئی۔ یہی رحمت جو کتابوں کو دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا، آج خود ہی پڑھنے کو کہہ رہا ہے۔

والد نے بھی حقّے کی نالی کو زور سے دبایا۔ وہ بھی سخت حیران تھا لیکن بڑے تحمّل سے بولا "اگر... اگر.... تم واقعی پڑھنے لکھنے کے خواہش مند ہو تو میرا خیال ہے کہ طارق ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ ہاں تم ضرور سیکھو۔ اپنی ساری طاقت اور کوشش سے پڑھو لکھو کیونکہ علم بہت بڑی دولت ہے اور اس سے بڑھ کر زندگی میں اور کوئی نعمت نہیں ہے۔"

اب تو باپ بھی بڑے جوش میں آگیا۔ دو منٹ حقّے کے گہرے کش لگاتا رہا اور پھر بولا "ان لڑکوں کو دیکھو جو کل تک سکول جاتے تھے اب وہ نوکریاں کر رہے ہیں۔ اچھے گھروں میں رہتے ہیں اور عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

اتنی دیر بات چیت کرتے کرتے رحمت کا گلہ سوکھ گیا۔ گھڑے سے اُس نے پانی کا ایک گلاس بھرا۔ غٹ غٹ غٹ کر کے پانی پیا۔

"اچھا ابا جی۔ مَیں اب چلا" وہ صحن سے باہر آیا۔ مایوسی جاتی رہی۔ وہ خوشی خوشی طارق کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دل میں یہی خیالات آ رہے تھے "اُمید ہے طارق مجھے پڑھانے سے انکار نہیں کرے گا۔" اُس نے لمبے لمبے ڈگ بھرے اور جلد ہی اُن کے گھر پہنچ گیا۔

دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے وہ ذرا رُکا۔ صحن میں باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اُسے ایسے لگا جیسے بہت سی عورتیں ایک ساتھ بول رہی ہیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر مکّے سے دروازہ پیٹا اور انتظار کرنے لگا۔

طارق کی ماں نے دروازہ کھولا۔ رحمت کو دیکھتے ہی ہنس کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "بیٹا، تم طارق کو ملنا چاہتے ہو؟ وہ اندر سکول کا کام کر رہا ہے۔ جاؤ اندر چلے جاؤ۔"

صحن میں سے ہوتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ ترچھی نگاہوں سے اُس نے

صحن کی طرف دیکھا۔ چارپائیوں پر چھ سات عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اور چائے پی رہی تھیں۔

"شکر ہے مجھے وہاں بیٹھنا نہیں پڑا۔ ورنہ ان کی باتوں سے تو میرا دماغ چل جاتا"..... اُس نے سوچا۔

آخری کمرے کے پاس پہنچ کر اُس نے بڑے ادب سے کہا۔"مَیں اندر آسکتا ہُوں جناب!"

"آیئے تشریف لائیے"

رحمت کمرے میں داخل ہُوا۔ طارق ایک میز کے سامنے بیٹھا سکول کا کام کر رہا تھا۔

طارق نے فُٹّہ زور سے میز پر مارا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وُہ سخت ناراض ہے۔ اُونچی آواز میں بولا "آج کدھر بھُول پڑے؟ کبھی پہلے ہماری یاد نہ آئی جناب کو؟"

"چُپ اوئے چُپ صاحب بہادر۔ بولتا کیسے ہے۔ تجھے معلوم نہیں آج کل مَیں کام کرتا ہُوں اور جب شام کو گھر واپس آتا ہوں تو بہت تھک جاتا ہُوں"۔

"اچّھا اچّھا.... اب ذرا اپنی زبان کو لگام دے اور بیٹھ جا۔ مَیں فٹافٹ اپنا کام ختم کر لوُں۔ طارق جلدی جلدی باقی کام ختم کرنے لگا۔

رحمت ٹکر ٹکر کتابوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو میز پر اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں "یار طارق، مَیں اس لیے آیا ہُوں کہ توُ مجھے بھی لکھنا پڑھنا سکھا دے"۔

طارق ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہیں... کیا کہا!!! تو! اور پڑھنا چاہتا ہے!"

"ہاں ہاں طارق، مَیں کہہ رہا ہوں کہ مَیں لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تو سمجھا نہیں ..... مَیں کوئی فارسی یا عربی تو بول نہیں رہا۔ صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے پڑھنا لکھنا سکھا دے۔"

"اوئے آہستہ بول نا۔ کیوں میرے کان کے پردے پھاڑے ڈالتا ہے" پھر سر سے اشارہ کیا کہ بیٹھ جائے۔ مُنہ میں پنسل دبا کر رحمت کو مخاطب کر کے کہا "سُن بھئی۔ اگر میں تجھے پڑھنا لکھنا سکھاؤں تو تُو مجھے کیا دے گا؟"

"ہائے" کہہ کر رحمت ایک موڑھے پر ایسا بیٹھا جیسے کسی نے اُس کے سر پر ڈنڈا دے مارا ہو۔ لیکن دِل ہی دِل میں ہنس رہا تھا کہ طارق اُس سے فقط مذاق کر رہا ہے۔ لیکن پھر بھی مصنوعی عاجزی کی آواز میں کہا۔

"طارق تو تو جانتا ہی ہے کہ مَیں تو تجھ سے بھی زیادہ غریب ہوں۔ مَیں تو موٹریں صاف کرتا ہوں لیکن مَیں تو سوچتا تھا کہ تُو میرا پُرانا یار ہے، اور مجھے مُفت ہی پڑھا دے گا۔"

اُس نے طارق پر اثر ڈالنے کے لیے ایک ٹھنڈی سانس لی لیکن اچانک ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے دیکھا کہ طارق کے پیچھے ایک صندوق پر چائے اور بسکٹ پڑے ہوئے ہیں۔

"اوئے پڑھاکُو آج کل تجھے چائے پینی بھی یاد نہیں رہتی۔" اُس نے چائے اور بسکٹ کی طرف اشارہ کیا "آج تو مہمان آئے ہوئے ہیں اس لیے تجھے بھی کچھ مل گیا ہے۔"

"بکواس بند کر۔" اس نے جیسے بڑے غصّہ میں کہا ہو واقعی وُہ چائے پینی بھُول گیا تھا۔ "وہ اس وقت تو چائے نہیں پیتے تھے لیکن آج مہمانوں کی وجہ سے اُسے بے وقت چائے ملی تھی پھر ہنستے ہوئے کہا "اب ہم

چائے پئیں گے۔ اور تم ہمارا منہ تاکو گے۔"

طارق نے چائے اٹھائی۔ بسکٹوں کے دو حصے کئے۔ اور رحمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔" لو جی۔ تم بھی آج عیش کر لو ہم تو ہمیشہ بانٹ کر ہی کھاتے ہیں۔"

رحمت مزے سے بسکٹ کھانے لگا۔ دل میں سوچ رہا تھا۔" طارق تو مذاق کر رہا ہے۔ پھر بھی میں اُسے ضرور کچھ نہ کچھ دوں گا۔ اس نے اپنی انگلیاں چاٹتے ہوئے کہا۔" میں نے سوچ لیا ہے کہ میں تجھے کیا دوں۔ پہلے تو میں تجھے وہ غبارہ دوں گا جو مجھے میرے ماموں نے تحفے میں دیا تھا۔ اور اس کے بعد جب تو مجھے اور پڑھائے گا تو بعد میں کچھ اور دوں گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

طارق کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔" بہت اچھا ساہوکار صاحب۔ تو پھر آج ہی ہو جائے۔ پہلا سبق۔"

جلدی جلدی اُس نے میز پر سے کتابیں سمیٹیں اور انہیں صندوق پر رکھا۔

رحمت پہلا سبق لینے کے لیے بیتاب تھا۔ اس نے طارق سے کہا۔" اگر اجازت ہو تو میں دوڑ کر گھر سے سلیٹ لے آؤں۔" وہ بجلی کی سی تیزی سے دوڑتا ہُوا گھر گیا اور پلک جھپکتے ہی ہاتھ میں سلیٹ پکڑے واپس آگیا۔

طارق نے مذاق کرتے ہوئے کہا مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم گھوڑے سے بھی زیادہ تیز دوڑ سکتے ہو۔ اچھا اب زمین پر بیٹھ جاؤ۔ دائیاں گھٹنا اوپر کرو اور لکھو۔ الف۔ اس طرح ایک سیدھی لکیر۔۔۔ یہ ہے الف۔۔۔۔۔ آسان ہے نا۔"

رحمت کی تھوڑی سی زبان ہونٹ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ سلیٹ کو اس نے بڑی مضبوطی سے پکڑا ہُوا تھا۔ اور جیسے جیسے طارق اُسے بتا رہا تھا، ویسے ویسے وہ لکھ رہا تھا بعض الفاظ تو اتنے ٹیڑھے میڑھے ہوئے کہ

انہیں دیکھ کر طارق زور سے ہنس پڑتا۔ لیکن رحمت بالکل ناراض نہ ہوا اور بڑی محنت سے لکھتا رہا۔

اسی طرح رحمت ہر روز کام سے فارغ ہو کر طارق کے گھر آتا اور طارق اُسے لکھنا پڑھنا سکھاتا۔ طارق اس کے شوق اور ترقی سے بڑا خوش تھا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رحمت دل چھوڑ بیٹھتا۔ اور خیال کرتا کہ وہ کچھ ترقی نہیں کر رہا ہے۔ دو چار مرتبہ اس نے چاہا کہ سلیٹ کو دور پھینک دے اور اُسے پھر کبھی نہ دیکھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اُسے یہ احساس ہونے لگا کہ اُس نے کافی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ دس ماہ میں اس نے سارے قاعدے ختم کر لیے اور اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ خود ہی چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھ لے۔

رحمت کے ماں باپ اُس کے اِس شوق کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور اکثر باتیں کرتے "عجیب بات ہے۔ پہلے تو وہ کتاب کو ہاتھ بھی نہ لگاتا تھا پڑھنا تو درکنار وہ تو انہیں چھوتا تک بھی نہیں تھا۔ لیکن اب وہ کس قدر دل لگا کر پڑھ رہا ہے۔" انہیں کبھی یہ خیال ہی نہ ہوا کہ یہ اس درزی کی ہی نصیحت کا نتیجہ تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اب اس قدر دل لگا کر لکھ پڑھ رہا تھا۔

پانچواں باب

سردیاں بیت گئیں اور مختصر سے موسم بہار کے بعد پھر گرمی کا زمانہ آگیا۔ مئی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ شدید گرمی کی لہر آئی ہوئی تھی۔ ہر طرف پانی کی کمی تھی اور بیماریاں پھیل رہی تھیں۔

آج پھر رحمت اپنے باپ کے پیچھے سائیکل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا باپ آہستہ آہستہ سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے باتیں کرتے اپنے گھر کی طرف واپس آرہے تھے۔

"ابا جی، میں سیدھا طارق کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ چلتے چلتے اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ پڑھنے کا وقت ہی نہیں رہتا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا، جیسے تمہاری مرضی۔ میں تمہاری ماں کو بتا دوں گا۔ کہ تم کہاں ہو۔"

رحمت جھٹ سائیکل سے کود گیا اور اپنے دوست کی طرف چل دیا۔ باپ بڑے فخر سے اُسے دور تک دیکھتا رہا یہ تو کسی معجزہ سے کم نہیں کہ وہ اتنا دل لگا کر پڑھ رہا ہے۔ لکھ پڑھ کر وہ بہت کچھ کر سکتا

ہے۔" آج اُس کا دل بہت خوش تھا وہ سائیکل چلاتا چلاتا اپنے صحن میں داخل ہوگیا۔ ذہن میں بار بار یہی خیال آتا۔" کاش جب میں لڑکا تھا تو میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا۔ میں پڑھنے میں کس قدر تیز تھا اور مجھے شوق بھی کتنا تھا۔ مگر ماں باپ خرچ نہ اٹھا سکے اور اب تو کام کی بک بک سے ہی فرصت نہیں ملتی۔"

اُسے اتنا فخر ضرور تھا کہ آج رحمت وہی شوق دکھا رہا ہے جو شوق لڑکپن میں اُس کا تھا۔ رحمت کو بھی آج پڑھنے لکھنے میں اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کسی وقت اُسے پہلے تھی۔

جب رحمت اپنے دوست کے مکان کی طرف جا رہا تھا تو آہستہ آہستہ ایک گیت گنگناتا جا رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اُس نے زور سے کھٹکھٹاتے ہوئے کہا" کوئی ہے؟"

طارق نے کمزور سی آواز نکالی۔" اندر آجاؤ۔"

رحمت کو ایک دم احساس ہُوا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ چارپائی کے نزدیک پہنچ کر رحمت نے کہا۔" طارق کیا تم واقعی تھکے ہوئے ہو یا مذاق کر رہے ہو؟" لیکن طارق کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ سخت تکلیف میں ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور مدھم آواز میں کہا۔" دوست! آج میں تمہیں پڑھا نہ سکوں گا۔" وہ بستر پر اِدھر اُدھر کروٹیں بدل رہا تھا۔ بس یہی جملے اُس کے مُنہ سے نکلتے تھے۔" ہائے میرا سر..... ہائے اماں جی..... اُف میرے پیٹ میں سخت درد ہے..... ہائے میں مرگیا..... رحمت..... میں مرگیا۔"

رحمت اُسی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اور اُس کے سر کو دبانے لگا۔
"دوست تمہیں تو بخار بھی چڑھا ہُوا ہے..... کل تک تو تم بھلے چنگے تھے۔ یہ تمہیں رات رات میں کیا ہوگیا ہے۔ میرے پیارے دوست؟"
طارق نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا: "ہائے۔ دو چار دن سے طبیعت گری گری سی تھی۔ ہلکا ہلکا سردرد تھا۔ لیکن مَیں نے پرواہ نہ کی۔ بس یہی سوچا کہ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ہائے.... ہائے..."
طارق کی ماں نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا: "اچھا تم ہو رحمت مَیں نے باتوں کی آواز سُنی تو حیران ہوئی کہ کون آیا ہے..... طارق بیٹے، اب کیسی طبیعت ہے؟" سر اور ماتھے کو چھُوتے ہُوئے اس سے کہا: "بخار تو اب بھی بہت تیز ہے بیٹے، میں ابھی جاتی ہوں۔ اور اپنے لعل کے لیے حکیم صاحب سے اچھی سی دوائی لاتی ہوں۔"
اُسی دم طارق جلدی سے اٹھا۔ وہ جلدی جلدی صحن میں جانا چاہتا تھا لیکن اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وُہ اسی جگہ بیٹھ گیا اور ایک بڑی سی قے کی۔ نڈھال ہوکر وہ سر پکڑ کر زور زور سے کہنے لگا "ہائے اماں جی..... ہائے میں مر گیا۔" اور مشکل سے واپس اپنی چار پائی تک آیا۔
ماں نے پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میری جان، فکر نہ کر۔ بس تُو کل تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی دوائی لاتی ہُوں، بس تم سونے کی کوشش کرو۔"
لیکن طارق کی ماں کا دل دھڑک رہا تھا۔ اپنی پریشانی میں وہ سوچ رہی تھی: "طارق کے ابا تو رات گئے گھر واپس لوٹتے ہیں، کیا میں اُس وقت

تک انتظار کروں!! پہلے ہی طارق کے دو بھائی بچپن میں ہی مر چکے ہیں۔ اب اس کی صرف ایک بہن ہے جو شادی شدہ ہے۔ ہائے خدا نہ کرے میرے طارق کو کچھ ہو جائے۔ خداوند رحم کر۔"

طارق نے آنکھیں کھول کر رحمت کی طرف دیکھا "دوست۔ آج وہ کل والی کہانی ہی دہرائیے میں آج نیا سبق نہ پڑھا سکوں گا۔"

"تو کیا میں کتاب لے جاؤں!"

"ہاں کتاب گھر لے جاؤ اور کل والی کہانی پھر پڑھ لو۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ کتابیں کہاں رکھی ہیں۔"

"اچھا طارق میں اب گھر چلتا ہوں۔ کل جلدی آؤں گا۔" وہ کتاب لے کر آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

گھر آکر اس نے اپنے والدین کو طارق کی بیماری کے بارے میں بتایا سب بہت افسوس کرنے لگے۔ ماں نے ہانڈی میں چمچ چلاتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ "کل تک تو طارق بالکل ٹھیک تھا آج کل تو کوئی ایسی بیماری بھی نہیں ہے۔ پھر اُسے کیا ہو گیا ہے۔ شاید معمولی بخار ہے۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

رحمت نے چارپائی پر بیٹھ کر کتاب کھولی۔ لیکن ایسے لگا جیسے لفظ ناچ رہے ہوں۔ وہ کچھ پڑھ نہ سکا۔ اس کا دھیان طارق ہی کی طرف تھا۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اور لیٹ گیا۔ اب بھی طارق کی ہائے ہائے اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور اپنی ماں کو دیکھنے لگا۔ جو روٹیاں پکا رہی تھی۔ اُسے بالکل بھوک نہ تھی۔ لیکن جب ماں نے سرسوں کے ساگ میں ڈھیر سا مکھن رکھ کر رحمت کو آواز دی۔

تو ساگ دیکھ کر اُس کی بھوک چمک اٹھی اور اس نے پیٹ بھر کر روٹی کھائی۔

چولہے کے پاس بشیرہ اور آستر اپنی ماں کی مدد کر رہی تھیں۔ لیکن رحمت پلنگ پر لیٹے ہی سو گیا۔ اُسے کچھ معلوم نہ ہُوا کہ کب اُس کا والد پڑوس والے گھر سے آیا ں جہاں وہ گپیں مارنے گیا تھا۔ اور کب وہ پلنگ پر لیٹا۔

اُدھر طارق سخت تکلیف میں تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور پیٹ کا درد بھی اُسے چین نہ لینے دیتا تھا۔ وہ بالکل ادھموا سا ہو رہا تھا۔

آدھی سے زیادہ رات گذر چکی تھی لیکن طارق کے ماں، باپ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ انہیں طارق کے بارے میں بے حد فکر تھی۔

"مَیں نے تمہیں کہا نا تھا کہ حکیم صاحب کی دوائی نے کچھ کام نہیں کیا ہے۔ بچّے کو ذرا بھر فائدہ نہیں ہُوا ہے۔" طارق کے باپ نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ابھی وقت ہی کون سا ہُوا ہے! آج ہی تو دوا شروع کی ہے۔ آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھائے گی۔" طارق کی ماں نے اپنے بچّے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کاش آپ ذرا جلدی آجاتے تو حکیم صاحب سے کوئی اور اچھی دوائی لے آتے۔"

طارق کے ابّا نے ذرا اونچی آواز میں کہا "مجھے یوں الزام نہ دو۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ میں ٹیکسی چلاتا ہوں اور جب تک مالک کی رقم پوری نہ کر لوں، میں واپس نہیں آسکتا۔ آج کوئی سواری مل ہی نہیں رہی تھی۔ گھر کیسے جلدی آجاتا۔"

طارق کی ماں نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "میرا یہ مطلب نہیں لیکن ہائے میں کیا کروں کہ میرا بچّہ ٹھیک ہو جائے۔"

"کاش تم میری مان لیتیں۔ بچّہ سخت بیمار ہے۔ اُسے ضرور ہسپتال میں داخل کروانا چاہیئے تھا۔ لیکن تم ہو کہ سنتی ہی نہیں۔"

طارق کی ماں کے آنسو پھر بہنے لگے۔ "ہائے میں اُسے کیسے ہسپتال چھوڑ آؤں۔ اگر اُسے وہاں کچھ ہو گیا، تو اُس غیر جگہ بڑے بڑے لمبے کمروں میں میں کیا کروں گی!" "آپ کیوں اتنے سخت دل ہیں!"

"میں بھلا کب کہہ رہا ہوں کہ اُسے وہاں کچھ ہو جائے گا۔ لیکن ہسپتال کے صحیح علاج سے وہ شاید جلد ٹھیک ہو جائے۔"

ماں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "توبہ۔ توبہ۔ وہاں تو مریضوں کا ذرا بھی خیال نہیں کیا جاتا۔ رضیہ کی ماں بتا رہی تھی کہ وہاں کوئی رتی بھر پرواہ نہیں کرتا۔"

"لیکن تم تو اپنے بچّے کے پاس رہ سکتی ہو۔ اور ہر قسم کا خیال رکھ سکتی ہو"۔ باپ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

لیکن ماں کچھ ماننے کو تیار نہ تھی۔ "ہائے نہیں۔ میں ہسپتال میں نہیں رہ سکتی۔ میں تو وہاں گم جاؤں گی۔ پھر وہاں مرد بھی تو بہت ہوتے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

طارق کا والد یہ سب جانتا تھا لیکن پھر بھی یہی چاہتا تھا کہ بچّہ ہسپتال میں داخل کرایا جائے۔ کیونکہ وہاں ہی درست علاج ہو سکتا ہے۔ اور وہاں ہی اُس کا بچّہ صحت یاب ہو سکتا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اچھا خیر دیکھو کل کیا ہوتا ہے۔"

ایک ہفتہ میں طارق بالکل ہڈی چمڑا ہو گیا۔ اب تو اس کی ماں بھی رضامند ہو گئی کہ اسے جلد از جلد ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔

رحمت اپنے دوست کے بغیر بڑا اداس تھا۔ ہر شام وہ اکٹھے بیٹھتے کھیلتے اور پڑھتے، لیکن اب وہ بالکل اکیلا تھا۔ پانچ دن اور گذر گئے۔ اُسے اپنے دوست کی کوئی خبر نہ ملی۔ طارق کی ماں تو اُس کے ساتھ ہسپتال میں ہی رہتی تھی اور باپ رات گئے واپس گھر آتا۔

ایک شام جب رحمت کام سے واپس آیا اور اپنی گھر والی گلی میں مڑا، تو اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ نزدیک ہی ماتم کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اُس نے اپنے والد کی آستین کھینچتے ہوئے کہا "ابا جی، رونے کی آواز طارق کے گھر کی طرف سے آ رہی ہے۔"

دونوں غور سے سننے لگے۔ واقعی آواز طارق کے گھر سے ہی آ رہی تھی۔ باپ نے گھبرائے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا اور کہا "شاید طارق....." لیکن اس میں جملہ مکمل کرنے کی سکت نہ تھی۔

دونوں آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ دروازے پر رحمت کی ماں اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ صرف انگلی سے طارق کے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ اور جھٹ دوپٹے میں اپنا منہ چھپا لیا۔

جب رحمت کا باپ دیوار کے سہارے سائیکل کھڑا کر چکا تو ماں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "بچارا طارق آخر چل ہی بسا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے وہ اس کی لاش کو ہسپتال سے لائے ہیں۔ ہائے مجھے تو یقین ہی نہیں آتا۔ ابھی اس دن ہی تو وہ رحمت کو پڑھا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بچہ چل بسا۔ ہائے ابھی اُس نے دیکھا ہی کیا تھا! اس کی ماں تو غم سے پاگل ہوئی جا رہی ہے۔ اب بھلا اُن کا اور ہے ہی کون؟"

رحمت کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اور اب تیزی سے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ اُسے سخت دھچکا سا لگا۔ اُسے اب تک یقین نہیں آتا ہے کہ طارق مرگیا ہے۔

"امّی، کیا میں طارق کی لاش کو دیکھ سکتا ہوں۔" اس نے غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہاں بیٹے ضرور۔ وہ تو تمہارا گہرا دوست تھا۔ جاؤ تم اُس کے گھر چلے جاؤ۔"

رحمت اپنے دوست کے گھر کی طرف چل دیا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے پاؤں من من کے ہوں۔ اس سے سیدھا چلا ہی نہیں جاتا تھا۔ وہ تو اب تک ہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ شاید جب وہ پھر بیدار ہو تو اس کا جگری دوست اُسے ہنستے کھیلتے ملے گا۔ لیکن رونے اور ماتم کی آواز اس کے خواب کی صحیح تعبیر نہ تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ دروازے کے اندر داخل ہوا۔ کئی رشتہ دار وہاں جمع تھے۔ آہستہ آہستہ وہ طارق کی ماں کے قریب پہنچا اور گلوگیر آواز میں کہا: "ماسی جی میں اپنے دوست کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

طارق کی ماں نے اس کے کندھے کا سہارا لیا اور پلنگ کے پاس اُسے لے گئی۔ مُنہ پر سے کپڑا اٹھا کر روتے ہوئے کہا "رحمت بیٹے، یہ ہے تمہارا دوست۔ وہ ہم سے روٹھ گیا ہے اور بولتا نہیں ہے بیٹے....."

رحمت خاموشی سے کھڑا اپنے دوست کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ کتنے سکون سے طارق سو رہا تھا۔ دِل سے بار بار یہی آواز

اُٹھتی: "طارق... تو کہاں ہے؟ طارق..... تو کہاں ہے؟"

رحمت کے خیالات کا سلسلہ یکدم ٹوٹ گیا۔ طارق کی ماں زور زور سے روتی ہوئی اپنے بیٹے کی لاش پر گر پڑی اور کہنے لگی: "میرے بیٹے تو کیوں ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ ہائے میرے بیٹے تو کیوں چلا گیا ہے؟"

اُس کے خاوند نے بڑی مشکل سے اُسے اُوپر اٹھایا اور تسلی دیتے ہوئے کہا: "صبر سے کام لو۔ گئے ہوئے بھلا کب واپس آتے ہیں"۔ اور اسے دُور ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔

رحمت بھی خاموشی سے دبے پاؤں باہر آگیا۔ سر جُھکائے اپنے گھر کی طرف جاتے وقت بس ایک ہی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی: "طارق تو کہاں ہے؟..... طارق تو کہاں ہے؟"

ایک اور خیال اس کے ذہن میں اُبھرا۔ جسم کے مر جانے کے بعد انسان کیا کبھی زندہ نہیں ہوتا؟ ابّا نے موت کے بارے میں کیا بتایا تھا؟"

اُسے باپ کی وہ بات بار بار یاد آرہی تھی: "جب ہم مریں گے تو خُدا ضرور ہم پر رحم کرے گا۔ اور ہمیں آسمان پر لے جائے گا"۔ ابّا نے تو یہی بتایا ہے، لیکن موت۔ آسمان اور خُدا کے بارے میں تو اسے کوئی خاص بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

وہ اپنی گلی میں مڑنے والا تھا لیکن نا معلوم کیوں اُسے ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے گھر جائے۔ وہ سیدھا چلتا گیا اور باہر کھیت کے منڈیر پر جا بیٹھا۔ یہاں وہ بالکل تنہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں اُوپر اٹھائیں۔ جھلملاتے تارے اُسے نظر آئے۔ "خُدا کہاں ہے؟ آسمان کہاں ہے؟ شاید ان ستاروں کے پیچھے آسمان ہو"۔ اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں میں

اپنا منہ تھاما۔ وہ سوچ رہا تھا: "اگر خدا ہے، تو وہ کون ہے؟ وہ اپنے آپ کو ظاہر کیوں نہیں کرتا کہ ہم اُسے جان جائیں"! لیکن ان سوالوں کا اُسے کوئی جواب دینے والا نہیں تھا: "لوگ کہتے ہیں کہ خدا بہت عالی شان ہے اور بہت بڑا ہے۔ کیا میں جب مروں گا تو وہ مجھے آسمان میں آنے کی اجازت دے گا! میں تو بہت ہی غریب لڑکا ہوں۔ اور اب تک تو میں نے اُس کی کوئی پرواہ نہیں کی ہے"۔

اچانک اُسے اُس خدا سے جسے وہ جانتا نہ تھا ڈر محسوس ہونے لگا۔ اب وہ اُس کو ملنا نہیں چاہتا تھا۔

اُسی وقت اُس نے ارادہ کر لیا کہ اب تو وہ خدا کے بارے میں جاننے کی پوری پوری کوشش کرے گا: "میرا باپ تو خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے۔ لیکن وہ بھی تو خدا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا ہے"۔ رحمت تنہائی میں بیٹھا انہی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے پھر اپنا پیارا دوست یاد آیا جو اُسے پھر کبھی نہیں ملے گا۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

رونے سے اُس کا دل ذرا ہلکا ہوا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کا رُخ کیا۔ گھر میں صرف ماں تھی اور اس کی گود میں چھوٹا فلپ تھا: "آؤ بیٹا میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ تمہارے ابا تو جنازے پر گئے ہیں اور دونوں لڑکیاں اپنی سہیلیوں کے گھر میں ہیں۔ بس آنے ہی والی ہوں گی"۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ اور جان بوجھ کر طارق کا نام نہ لیا۔ وہ جانتی تھی کہ رحمت کو اپنے دوست کی جدائی کا کتنا گہرا صدمہ ہوا ہے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے سے کوئی تسلی کی بات نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی خدا کے بارے میں جو

اُن کا آسمانی باپ ہے کچھ بتا نہیں سکتی تھی۔ جب بھی زندگی میں ایسے مواقع آئے، تو وہ اکثر یہ سوچتی تھی کہ موت کے بعد میرا کیا ہوگا۔ لیکن ہمیشہ یہی سوچ کر خاموش ہو جاتی "بھلا خُدا کو کون جان سکتا ہے؟ میری سمجھ سے تو یہ باہر ہے اِس لیے مجھے اس کے سمجھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

چھٹا باب

چند دن تو رحمت بالکل گم سم رہا۔ اِس لیے اس کی ماں نے اُسے کام پر جانے نہ دیا۔ تین دِن کے بعد جب وُہ مارکیٹ میں گیا تو وہاں اس کا بالکل دل نہیں لگتا تھا۔ وُہ بالکل بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہتا۔ پیسے کمانے کی بھی اُسے کوئی پرواہ نہ ہوئی۔ موٹریں اُس کے قریب آ کر رُک جاتیں۔ لیکن اُسے ذرا دھیان نہ ہوتا۔ سارا دِن وُہ اسی انتظار میں رہتا کہ اُس کا باپ آئے اور اُسے گھر لے جائے۔

ایک صُبح وُہ بہت اداس تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وُہ اپنے پُرانے دوست، درزی کے پاس جائے۔ آج مارکیٹ میں بہت سی موٹریں کھڑی تھیں اور وہ خاصی رقم کما سکتا تھا۔ لیکن اُسے اِس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ گرمی خاصی تھی۔ موٹریں، رکشا اور ٹیکسیاں تیزی سے اِدھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ ایک دو منزلی بس شور کرتی ہوئی اُدھر سے گزری۔ خالنسامے سائیکلوں پر سودا لادے اپنی اپنی کوٹھیوں کی طرف گھنٹی بجاتے اُڑے چلے جا رہے تھے۔ کچھ آ رہے تھے اور دکانداروں سے سودا بازی کر رہے

تھے۔ ایک بڑا سا ٹرک گڑگڑاتا ہوا وہاں سے گزرا اور کوکا کولا والی دکان کے سامنے جا رکا۔ ملازموں نے بوتلیں اتارنی شروع کر دیں۔ بازار میں بہت رونق اور گہما گہمی تھی۔ لیکن رحمت ان سب باتوں سے بے نیاز صرف اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بار بار اپنے پیٹ کو سہلاتا تھا۔ اس کے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد تھا اور سر بھی چکرا رہا تھا۔ کبھی کبھی اُسے خیال آتا کہ ملیریا بخار تو نہیں چڑھ رہا۔ اُس کی طبیعت گری گری تھی۔ چلتے چلتے وہ درزی کی دکان پر جا پہنچا۔

"اسلام علیکم ماسٹر جی۔"

درزی نے تیزی سے مشین کا ہینڈل گھماتے ہوئے کہا۔ "وعلیکم اسلام۔" اور جب مشین چلنی بند ہوئی تو اوپر دیکھ کر کہا۔ "بیٹا بڑے وقت پر آئے ہو۔ ذرا ہاف سیٹ چائے تو پکڑ لاؤ۔"

رحمت کو باباجی کے کام کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اس لیے وہ ایک دم چائے والی دکان کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن چاہتا تھا کہ جلد از جلد بیٹھ جائے۔ سر درد تیز ہوتی جا رہی تھی۔

ذرا سی دیر میں وہ چائے لے کر آ گیا۔

"شاباش میرے بیٹے۔" درزی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب وہاں بیٹھ جاؤ اور کچھ گپ شپ ہو جائے۔ درزی نے اپنے پیالے میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔

رحمت فرش پر بیٹھ گیا۔ دونوں کنپٹیوں کو ہاتھ سے دباتے ہوئے بولا۔ "ماسٹر جی، آج تو سخت گرمی پڑ رہی ہے۔"

"ہاں بیٹے مئی کا مہینہ ہے گرمی تو پڑے گی۔ لیکن تم بتاؤ تم کافی دنوں

سے نظر نہیں آئے۔ کہاں تھے! کیا بیمار تو نہیں تھے!"

رحمت دُکان سے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا اور مدھم سی آواز میں بولا۔ "ماسٹر جی میرا ایک عزیز دوست تھا، طارق۔ وُہ گزرے ہفتے مر گیا تھا۔ مجھے اتنا صدمہ ہے کہ مَیں نہ کہیں جانا چاہتا تھا نہ ہی کسی سے بولنا پسند کرتا تھا۔"

"ہیں!! کیا کہا! طارق مر گیا!" درزی نے ایک دم مشین بند کر کے کہا۔ "وہی نا، جو تمہیں لکھنا پڑھنا سکھایا کرتا تھا۔" درزی نے پرچ میں پیالہ رکھا اور کہا۔ "تمہارے دوست کے مرنے کا مجھے بے حد افسوس ہے۔" اپنی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "لو بیٹا پیالے کو دھو لو اور باقی چائے تم پی لو۔"

رحمت درزی کی اس مہربانی کا ممنون تھا۔ پیالہ اٹھا کر وہ نلکے کی طرف گیا اور دھو کر واپس آیا۔ درزی دیکھ رہا تھا کہ رحمت کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اور وُہ بڑی بے دلی سے چل رہا تھا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا۔ "بچارا بچہ، اُسے اپنے دوست کے مرنے کا کتنا بھاری غم ہے۔ خیر ابھی تو نوجوان ہی ہے۔ جلد اپنے غم پر قابُو پا لے گا۔"

وُہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ مشین کی سوئی میں دھاگا ڈالا اور آستین کو متیض کے ساتھ برابر کر کے اس پر سلائی کرنے لگا۔ اُس نے رحمت کو واپس آتے دیکھا لیکن کچھ بھی نہ بولا۔ رحمت نے پیالے میں چائے ڈالی۔ دکان میں مشین کے چلنے کی آواز گونج رہی تھی۔

درزی اپنے خیالات میں ڈوبا ہُوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "میں کس

طرح اِس لڑکے کی مدد کر سکتا ہوں؟ اُسے تو کسی معقول جگہ نوکری کرنی چاہیئے۔ اب یہ اُس کی عُمر نہیں ہے کہ وُہ موٹروں کے پیچھے بھاگے۔ لڑکا ہوشیار ہے۔ تھوڑی مدّت میں اُس نے پڑھنے لکھنے میں خاصی ترقی کر لی ہے۔ اگر اُسے کہیں نوکری مل جائے تو اچھی طرح کام کرے گا۔"

"کڑکڑ کڑکڑ۔" درزی نے جھٹ آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ رحمت نے جلدی سے پیالہ پرچ پر رکھا اور تیزی سے باہر کی طرف دوڑا۔ ابھی آیا ماسٹر جی ایک منٹ میں آتا ہوں۔"

"ارے، نا معلوم اُسے کیا جلدی تھی۔" درزی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ دونوں آستینیں جوڑ کر اب اس نے دُوسرے جوڑوں پر سے ٹانکے توڑے اور قمیض کو زور سے جھٹک کر اپنی میز پر سیدھا بچھا دیا۔

اُسی لمحے رحمت آہستہ آہستہ چلتا ہُوا واپس آیا۔ "تم آ گئے! کیا کسی دوست کو ملنے گئے تھے؟"

"نہیں ماسٹر جی" اُس کا رنگ بالکل زرد ہو چکا تھا۔ پیٹ سہلاتے ہُوئے اُس نے کہا۔ "میری طبیعت خراب ہے۔ قے آئی تھی۔ اِس لیے میں باہر بھاگ گیا۔ ورنہ یہاں آپ کی دکان گندی ہو جاتی۔"

درزی نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ "نہ بابا یہاں قے نہ کرنا۔ لیکن کسی خیال سے وہ چونک پڑا اور بولا۔

"رحمت، مجھے یہ بتاؤ تمہارے دوست کو کیا بیماری تھی؟"

"مجھے بالکل ٹھیک تو معلوم نہیں لیکن کہتے ہیں اُسے معیادی بخار (ٹائیفائیڈ) ہو گیا تھا۔" اُس نے دیوار کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اور تمہاری طبیعت کتنے دنوں سے ایسی ہے؟"

"چند دنوں سے طبیعت گری گری سی ہے۔ لیکن امید ہے دو ایک دنوں میں درست ہو جاؤں گا۔ سر درد اور پیٹ کی تکلیف جاتی رہے گی۔ پھر میں اپنا دھندا شروع کر دوں گا۔" رحمت نے اپنی بیماری کی کوئی خاص پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن درحقیقت وہ سخت بیمار تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ بیماری معمولی نہیں ہے۔ لیکن درزی کے سامنے اپنی تکلیف کا اظہار کرنا اُسے اچھا نہ لگا۔ اُسے گھر میں علیحدہ پلنگ پر لیٹے رہنا پسند نہ تھا۔ اسی لیے وہ کوشش کر رہا تھا کہ ایسے ظاہر کرے جیسے اُسے کوئی خاص تکلیف نہیں ہے لیکن دل میں کہہ رہا تھا۔ "رحمت غفلت نہ کر ورنہ مشکل میں پھنس جائے گا۔"

اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے مُردہ دوست کا چہرہ آیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اس عمر میں وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔

درزی نے رحمت کی طرف غور سے دیکھا اور کہا۔ "سنو رحمت تم مجھ سے ایک کام کرنے کا وعدہ کرو۔"

"آپ مجھ سے کیا وعدہ کروانا چاہتے ہیں ماسٹر جی؟"

درزی نے رحمت کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آج شام جب تمہارا والد تمہیں لینے کے لیے آئے تو گھر جا کر تم اُس وقت تک لیٹے رہنا، جب تک تم بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتے ہو اور اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا علاج کرواؤ۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں بھی معیادی بخار ہی ہے۔"

رحمت گھبرا گیا اور کہا "نہیں ماسٹر جی یہ نہیں ہو سکتا۔"

لیکن درزی نے فیصلہ سُناتے ہوئے کہا "میں جو تم سے کہہ رہاں ہوں۔ وُہ ٹھیک ہے۔ تم وہی کرو۔ جو مَیں تم سے کرنے کو کہہ رہا ہوں"۔ دھاگے کی گولی سے دھاگہ توڑا "تمہارے باپ کے آنے میں ابھی کافی وقت ہے۔ تمُ وہاں درخت کی چھاؤں میں جا کر لیٹ جاؤ۔ اور آرام کرو۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ایک دم سیدھے میرے پاس آجانا"

"لیکن ماسٹر جی، میرا تو خیال ......"

جب رحمت نے درزی کی طرف دیکھا تو وُہ اُسے گھُور رہا تھا۔ رحمت ایک دم خاموش ہوگیا۔

"بیٹے، بحث نہیں کرتے بس میں جو کہہ رہا ہوں وہی کرو" درزی نے مشین کا ہینڈل زور سے گھمایا۔ کپڑا موڑتے وقت جب مشین چلنی بند ہوئی تو دھیمی آواز میں کہا "بیٹے میں تمہاری بہتری کے لیے ہی یہ کہہ رہا ہوں"

"ماسٹر جی میں آپ کا حُکم ضرور مانوں گا" یہ کہہ کر رحمت اُٹھا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے باہر کی طرف گیا اور گھاس پر لیٹ گیا۔

لیٹے لیٹے دل میں کہہ رہا تھا "آج تو درزی بڑی سختی سے بول رہا تھا۔ لیکن خیر، وہ میری بھلائی کے لیے ایسے کہہ رہا تھا" رحمت کو بھلا نیند کیسے آسکتی تھی۔ اُس کے دماغ میں جیسے ہتھوڑے چل رہے ہوں اور پیٹ کی درد سے وہ بار بار کروٹیں بدلتا۔ وُہ آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ "ابا جی... اب جلدی آجاؤ .... مجھے گھر لے چلو..... ہائے ابا جی .... میں مر گیا۔ ابا جی ...." درد اُسے چین نہ لینے دیتا تھا۔ وہ پیٹ پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ کبھی کھڑا ہوتا۔ کبھی دو چار قدم چلتا۔

آخر اُس نے فیصلہ کیا۔ "میں درزی کی دکان میں ہی چلتا ہوں۔ شاید باتیں کرنے سے خیال بٹ جائے۔ اکیلے بیٹھنے سے تو طبیعت اور زیادہ پریشان ہوتی ہے۔"

درزی نے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کچھ چین آیا؟"

لیکن رحمت نے اپنے آپ کو زمین پر دھم سے گراتے ہوئے کہا۔ "ہائے نہیں.... میری تو جان نکلی جا رہی ہے۔ ابا جی کے آنے تک میں یہاں ہی بیٹھنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ میرے بچے۔ کوئی دو گھنٹے میں تمہارا باپ بھی آ جائے گا۔ لیکن اس طرح کرو میرے بیٹے۔ یہ لو دس پیسے۔ وہ سامنے ڈاکٹر کی دکان سے دو "اسپرو" لے آؤ۔ اُن کے کھانے سے تمہیں تھوڑی دیر تو سکون مل جائے گا۔ سر درد ٹھیک ہو جائے گی اور بخار بھی کم ہو جائیگا۔"

بوڑھا درزی اپنے گھٹنے پر زور دے کر "ہائے" کہتا ہوا کھڑا ہوا "اب میں بھی تو بوڑھا ہو چلا۔ اٹھا ہی نہیں جاتا۔" اس نے الماری کے اُوپر سے ایک ڈبیہ اتاری اُس میں سے دس پیسے کا سکہ نکال کر رحمت کو دیا کہ وہ اپنے لیے اسپرو لے آئے۔ خود ایک گلاس میں پانی بھرا اور رحمت کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ آج اُسے رحمت پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ درد سے اُس کا مُنہ بالکل اُتر گیا تھا۔

رحمت واپس آیا تو اس نے دونوں گولیاں اُس کی زبان پر رکھیں۔ اور پانی کا گلاس اُسے دیا۔ رحمت نے "غٹ غٹ" دونوں گولیاں پانی کے ساتھ کھالیں اور بابا جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی، آپ کتنے مہربان ہیں۔ اگر آپ آج یہاں نہ ہوتے تو مجھے بھلا کون پوچھتا۔"

"یہ تو میرا انسانی فرض ہے بیٹے۔ اب تم بیٹھ جاؤ۔"
رحمت پھر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ اپنا سر دبانے لگا۔ درزی اپنی سلائی میں مشغول ہو گیا۔ پانچ منٹ کے بعد درزی نے مشین کا دھاگہ بدلتے ہوئے رحمت سے پوچھا: "کچھ فرق ہے بیٹے؟"
رحمت نے تھوڑی سی آنکھ کھول اور مسکرانے کی کوشش کی۔ "ہاں ماسٹر جی کچھ فرق ہے۔" لیکن دراصل درد پہلے کی ہی طرح تھا۔
آخر کار اُسے دُور سے اپنا ابّا نظر آیا۔ وہ ذرا سیدھا ہو بیٹھا اور خوشی میں کہنے لگا۔ "ماسٹر جی۔ ابّا آ رہے ہیں۔ آج تو ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کبھی آئیں گے ہی نہیں۔"
رحمت اٹھ کھڑا ہُوا۔ "ماسٹر جی۔ آپ کی مہربانی کا بے حد شکریہ۔ اب میں چلتا ہُوں۔"
"نہیں رحمت اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔ تمہارے ابّا اِدھر ہی آ رہے ہیں۔ تم بیٹھے رہو۔"
"لیکن ماسٹر جی۔۔۔۔"
"نہیں، آرام سے بیٹھے رہو۔" درزی نے کھڑے ہو کر اُسے نیچے بٹھا دیا۔
رحمت خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ذرا سا ہلنے سے اُس کے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ درزی دُکان سے باہر نکل کر اس کے باپ کو ملنے آگے چلا گیا تھا۔ کچھ دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔ پھر دکان کی طرف بڑھے۔ رحمت نے اتنا سُنا کہ درزی اس کے باپ کو کہہ رہا تھا۔ "میری مانو تو لڑکے کو سائیکل پر بٹھا کر سیدھے ہسپتال لے جاؤ۔"
اس کے ابّا نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کیا اُس کی حالت اتنی خرا

ہے ؟" پھر کچھ سوچ کر کہا "راستے میں حکیم کی دکان ہے۔ میں جاتے جاتے وہاں سے دوائی لے لیتا ہوں۔"

درزی نے پھر زور دیا اور کہا "بھائی صاحب، میری مانو اور اُسے ہسپتال لے جاؤ۔"

لیکن وہ پھر عذر کرنے لگا "ماسٹر جی، ہسپتال لے جانا اتنا آسان نہیں ہے۔ ایک تو ہسپتال بہت دُور ہے۔ دُوسرا نام ہُوا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر تو صرف صبح کے وقت مریضوں کو دیکھتے ہیں بھلا اس وقت وہاں کون ہو گا ؟"

ظاہر تھا کہ وہ لڑکے کو ہسپتال لے جانے سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن درزی نے اُس کی ایک نہ مانی، اور کہا "میرے بھائی اگر دیر کر دی تو یاد رکھو، اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ کیا تمہیں اُس کے دوست طارق کا انجام یاد نہیں ؟" پھر اُسے تسلی دیتے ہوئے بولا "آج کل تو اچھی سے اچھی دوائیاں نکلی ہوئی ہیں، بس اگر تم ایک دفعہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر کو دکھا دو۔ تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔"

رحمت کے باپ نے زمین کی طرف دیکھا اور کہا "ہسپتال ؟ تو میں اُسے کس ہسپتال میں لے جاؤں ؟"

"گھبراتے کیوں ہو دوست ؟ اُسے مشن ہسپتال میں لے جاؤ۔ ایک تو وہ ہے بھی نزدیک، پھر میرے کئی دوست وہاں داخل ہو چکے ہیں اور سب اس جگہ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔"

رحمت کا باپ اپنی پگڑی اتار کر سر کھجلانے لگا۔ اور کچھ سوچ کر بولا۔

"اگر ڈاکٹر نے اُسے ہسپتال میں داخل کر لیا، تو پھر کیا ہوگا؟"

"ارے اس کی کیوں فکر کرتے ہو!" درزی مسکراتے ہوئے بولا۔ "اگر ضروری ہو تو تم گھر چلے جانا اور اپنی بیوی کو رحمت کے پاس چھوڑ دینا۔ وہ اس کی دیکھ بھال کر سکے گی۔"

لیکن رحمت کا باپ دوسری مشکلات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "میری بیوی اور ہسپتال میں رہے!!! توبہ توبہ۔ وہ تو کبھی ہسپتال جانا ہی نہیں چاہتی۔ پھر وہ دوسرے بچّوں کی دیکھ بھال بھی تو کرتی ہے۔ اب رہ گیا میں... تو یہ بھی مشکل ہے۔ ان دنوں کام کا زور ہے۔ مجھے چھٹی مل نہیں سکتی۔ ہمیں بھی تو ایک ایک پیسے کی سخت ضرورت ہے۔"

تو پھر گھبراؤ نہیں۔ ہسپتال میں بڑی مہربان نرسیں ہیں۔ وہ خود ہی بچّے کی غور و فکر کر لیں گی۔" درزی نے اُسے تسلّی دی۔

اب دونوں دکان میں داخل ہوئے۔ جب باپ نے رحمت کی حالت دیکھی تو اُس نے ایک دم فیصلہ کر لیا کہ وہ درزی کی بات ضرور مانے گا۔

باپ کو دیکھتے ہی رحمت بھی اٹھ کھڑا ہوا اور دبی آواز میں کہا۔ "ہائے ابا جی۔ میں مر گیا...."

"فکر نہ کرو میرے بیٹے۔ بس سائیکل کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں سیدھا ہسپتال لے جاتا ہوں۔ اس نے رحمت کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اُسے سہارا دے کر چلایا اور درزی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی، آپ کی مدد اور مہربانی کا شکریہ۔ آپ نے میرے بچّے کی کتنی فکر کی ہے۔"

"شرمندہ نہ کرو دوست۔" دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا

دیئے اور رحمت کا باپ سائیکل پر سوار ہو کر ہسپتال والی سڑک پر مڑ گیا۔

رحمت کے پاس سے موٹریں اور بسیں گزر رہی تھیں لیکن اُسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ بخار کی شدّت سے اُس کا دِل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کبھی تو اُسے سخت گرمی لگتی لیکن دو منٹ بعد اُسے اتنی سردی لگتی کہ اُس کے دانت بجنے لگتے۔ اُسے اتنا معلوم ہُوا کہ اُس کا ابّا ایک بڑے سے دروازے میں داخل ہُوا۔ دروازے کے باہر بہت سے رکشا اور ٹیکسیاں مسافروں کے انتظار میں کھڑی تھیں۔

ابّا سائیکل سے نیچے اُترا اور رحمت کو اتارا "بیٹے یہاں ٹھہرو، میں سائیکل کو سٹینڈ پر رکھ کر آیا۔ گھبراؤ نہیں میرے لعل۔ یہاں تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے۔"

کانپتے کانپتے رحمت اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ہسپتال میں داخل ہوئے تو رحمت کو طرح طرح کی دوائیوں کی خوشبو آئی۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "ابّا جی کیسی عجیب خوشبو ہے! میرا تو دِل گھبرا رہا ہے۔"

ابّا نے اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "ڈرو نہیں میرے شیر بیٹے۔ ہسپتال میں تو ایسی خوشبو آتی ہے تم یہاں پہلے کبھی نہیں آئے ہو اس لیے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

لیکن رحمت نے ڈر کر کہا "ابّا جی..... میں ہسپتال میں نہیں رہوں گا۔ آپ صرف میرے لیے دوائی لیں اور مجھے گھر لے چلیں۔ ابّا جی..... ہیں ابّا جی....."

باپ نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا "گھبراؤ نہیں بیٹا۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"
وُہ آگے بڑھتے گئے۔ رحمت کا دل کر رہا تھا کہ ہسپتال سے باہر آ جائے
اور گھر دوڑ جائے۔ لیکن بخار اور کمزوری سے تو وہ چل بھی نہ سکتا تھا۔ اس
لیے وہ بھی آہستہ آہستہ اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔
ایک ڈاکٹر ادھر سے آتا اور تیزی سے دوسری طرف نکل جاتا۔ نرسیں
سفید وردی میں اِدھر اُدھر بھاگی پھر رہی تھیں انہیں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا
کہ کیا کریں یا کہاں جائیں۔ اتنے میں ایک بڑی ہی مہربان سی سسٹر اُدھر
سے گزری۔ ابّا نے ہمت سے کام لے کر اُسے سلام کیا اور پوچھا "کیا
آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ میں اپنے بچّے کو کہاں لے کر جاؤں۔ وُہ سخت
بیمار ہے۔"
سسٹر نے پیار سے رحمت کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اُس کے ابّا سے
کہا "آپ اس سامنے والے کمرے میں جا کر بیٹھ جائیں۔ باری باری وہاں
ڈاکٹر مریضوں کو دیکھتا ہے۔ وُہ اس بچّے کو بھی دیکھ لے گا۔" دونوں کمرے
میں داخل ہوئے اور خاموشی سے ایک بڑی سی بنچ پہ بیٹھ گئے۔
ایک بچّہ زور سے چلّایا۔ شاید اُسے سوئی لگائی جا رہی تھی۔ رحمت نے
جھٹ اپنے ابّا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں اُس کمرے کی طرف دیکھنے لگے۔
جہاں سے آواز آئی تھی۔ اُس کمرے کا دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ انہوں نے ایک
بچّہ دیکھا جو بخار کی شدّت سے بے حال اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا۔ ایک
نرس بار بار ٹھنڈا کپڑا اس کے سر پر اور تپتے ہوئے ہاتھ اور پاؤں پر
رکھتی۔ دو سال کا بچّہ تھا نرس بار بار کپڑے کو ٹھنڈے پانی میں ڈال کر
نچوڑتی اور بچّے پر رکھتی۔

رحمت کے باپ نے ہمدردی میں کہا: "بچارہ معصوم بچہ۔"

رحمت کے نزدیک ہی ایک اور بچہ بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جب نرس نے اشارے سے اس کی ماں کو اندر بلایا۔ تو لڑکا ایک دم چلّانے لگا: "میں نہیں جاؤں گا.... میں سوئی نہیں لگواؤں گا۔" لیکن اس کی ماں اُسے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی اس کمرے میں لے گئی۔ نرس نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور پیار سے اس کے گال کو سہلایا: "نہیں نہیں... تمہیں سوئی نہیں لگے گی۔ صرف آہستہ سے دوا لگا کر پٹی باندھ دیں گے اور بس... اچھا اب یہاں بیٹھ جاؤ... اور ہاں بتاؤ کیا نام ہے تمہارا؟ کس جماعت میں پڑھتے ہو؟ کوئی کہانی بھی آتی ہے تمہیں... ہم ابھی تم سے چڑیا چڑے کی کہانی سنیں گے۔"

بچہ یہ باتیں سُن کر چُپ ہو گیا۔ نرس نے آہستہ آہستہ پٹی اتاری۔ زخم پر مرحم لگا کر صاف پٹی باندھ دی اور ہنستے ہوئے کہا: "دیکھا نا... کوئی درد ہوئی؟"

بچے کی ماں نے کہا: "اس سُسرے کو تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ پچھلے ہفتہ ایک سائیکل سے ٹکرا گیا تھا۔ صبح پتنگ پکڑتے جو گرا تو سر پھٹ گیا... بڑا ہی شیطان ہے۔"

نرس مسکراتی رہی اور انہیں باہر روانہ کرتے ہوئے کہا: "تمہارا بچہ تو بڑا بہادر ہے۔ ذرا بھی نہیں رویا... شاباش۔"

باہر برآمدے میں ایک عورت کو پہیوں والی کرسی پر بٹھا کر لے جا رہے تھے۔ وہ بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ ایک آدمی بستر اور صندوق اٹھائے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ رحمت کے باپ نے کہا: "اس عورت کو

ضرور ہسپتال سے چھٹی مل گئی ہے۔ اور اب وہ اپنے گھر جا رہی ہے۔ وہ آدمی ضرور اُس کا خاوند ہوگا۔"

لیکن رحمت ان سب باتوں سے بے خبر تھا۔ لکڑی کے سخت بنچ پر بیٹھے بیٹھے وہ تھک گیا تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ ہوا کہ کب وہ عورت کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ جس کے بچے کا سر پھٹا تھا۔ اُسے تب ہی ہوش آئی جب اُس کے باپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور کہا۔" اٹھو رحمت.... اب تمہاری باری ہے۔" اور وہ رحمت کو سامنے والے چھوٹے کمرے میں لے گیا۔

کمرے میں ایک بزرگ سسٹر انہیں ملی۔ وہ رحمت کو دیکھتے ہی ایک دم سمجھ گئی کہ بچارے کی حالت بہت خراب ہے۔" بیٹے کیا نام ہے تمہارا"؟

"رحمت۔"

"رحمت بیٹے، اِس سٹول پر بیٹھ جاؤ۔ شاباش.... اب اپنا مُنہ کھولو.... اور تھرمامیٹر کو زبان کے نیچے رکھ لو.... اس طرح... شاباش۔" سسٹر نے رحمت کی کلائی تھامی اور اُس کی نبض گننے لگی۔

رحمت بڑے غور سے اُس جوان ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا، جو ایک میز کے سامنے بیٹھا ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔" یہ آپ کا لڑکا ہے"؟ اُس نے پوچھا۔

رحمت کے باپ نے جواب دیا۔" جی ہاں.... رحمت میرا بڑا بیٹا ہے۔ اُسے بڑا تیز بخار ہے اور پیٹ میں بھی درد ہے۔ کیا یہ ٹائیفائیڈ بخار تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب"؟ ڈاکٹر میز پر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

"سسٹر... وہ چارٹ کہاں ہے"؟

"یہاں ہی تو رکھا تھا ڈاکٹر صاحب" سسٹر نے آگے بڑھ کر دو ایک کاغذ اِدھر اُدھر الٹائے۔ "یہ رہا وہ چارٹ ڈاکٹر صاحب۔"

"توبہ بھئی، میں کب سے ڈھونڈ رہا تھا، لیکن مجھے نہیں ملا شکریہ سسٹر۔"

اب ڈاکٹر نے رحمت کے ابّا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میاں جی .... مہربانی سے اپنے لڑکے کا نام تو بتائیں۔"

اسی طرح ڈاکٹر نے رحمت کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں دریافت کیں اور سب چارٹ پر لکھتا گیا۔ پھر یہ سوال کیا۔ "میاں صاحب آپ کو کس طرح یہ خیال ہوا کہ لڑکے کو ٹائیفائیڈ ہے؟ کیا گھر میں کوئی اور بھی اس تکلیف میں مبتلا ہے"؟

ابّا نے جھٹ جواب دیا۔ "نہیں، ہمارے خاندان میں تو کسی کو یہ بخار نہیں ہے لیکن گزرے ہفتے رحمت کا ایک دوست اسی بیماری سے مرگیا تھا۔ چونکہ رحمت اس کے پاس بہت دفعہ گیا تھا۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہی تکلیف میرے بیٹے کو تو نہیں ہوگئی۔"

ڈاکٹر نے کندھے ہلاتے ہوئے کہا۔ "کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن میں اس کا معائنہ کرتا ہوں۔ یہ تو خون وغیرہ ٹیسٹ کرنے سے ہی معلوم ہوگا اچھا جوان .... ذرا یہاں تو آؤ میرے پاس۔"

ڈاکٹر صاحب نے رحمت کو اچھی طرح دیکھا۔ اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے اُس کے ابّا کی طرف دیکھا "میاں صاحب آپ کو اسے داخل کرانا ہوگا۔ بس چند دنوں میں یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

رحمت کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے اپنا منہ دوسری

طرف کر لیا۔

ڈاکٹر نے سمجھاتے ہوئے کہا: "مجھے افسوس ہے لیکن آپ اُسے داخل ضرور کروا دیں۔ شکر ہے آپ اُسے عین وقت پر یہاں لے آئے ہیں۔ اب اور دیر اس کے لیے بے حد خطرناک ہوگی۔ یہاں ہم پوری کوشش کریں گے کہ وہ جلد از جلد بالکل ٹھیک ہو جائے۔"

رحمت کا باپ یہ سُن کر سخت گھبرا گیا، لیکن اُس نے کافی دلیری دکھائی اور کہنے لگا: "ڈاکٹر صاحب، آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ اگر اُس کی حالت اتنی خطرناک ہو چکی ہے تو میں اُسے ضرور داخل کروا دیتا ہوں۔"

اُسی دم سسٹر نے ایک نوکر کو بلایا کہ وہ پہیوں والی کرسی لائے۔ رحمت کو آرام سے اُس پر بٹھا دیا گیا۔ سسٹر نے ایک نرس کو چارٹ تھماتے ہوئے بتایا کہ رحمت کو کون سے وارڈ میں اور کس نمبر پر لٹایا جائے۔

نوکر آہستہ آہستہ کرسی دھکیلنے لگا اور نرس چارٹ پکڑے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ آخر وہ ایک بڑے کمرے میں آئے۔ رحمت نے دیکھا کہ اس وارڈ میں اور بھی مریض ہیں۔ کچھ تو اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے، کچھ اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے تھے۔

وہ قدرے مطمئن تھا۔ کہ وہ اُس بڑے سے کمرے میں بالکل اکیلا نہیں ہے۔ بلکہ اور بھی بہت سے مریض اس کمرے میں اُس کے ساتھ ہیں۔

وارڈ کی سسٹر نے مُسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اُسے ایک صاف بستر پر لٹا دیا۔ اُس کے بعد اُسے کچھ معلوم نہ ہُوا کہ وہ کہاں ہے۔ یا اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ جلدی سے لوہے کا ایک سٹینڈ اس کے

بستر کے پاس رکھا گیا جس میں ایک بوتل لٹکی ہوئی تھی۔ بوتل سے چند نلکیاں جڑی ہوئی تھیں۔ جن کے آخر میں ایک موٹی سی سوئی تھی۔ وہی سوئی رحمت کی ایک رگ میں لگا دی گئی۔ اور گلوکوز سیدھا اُس کے خون میں جانے لگا۔ یہ رحمت کی طاقت کو بحال کرنے کے لیے لگایا گیا تھا، تاکہ وہ جلد از جلد اپنی بیماری پر قابو پا لے۔

تیز بخار سے رحمت بالکل بے ہوش سا تھا۔ بے خودی میں وُہ ڈر سا جاتا اور زور زور سے پکارنے لگتا۔ "طارق تُو کہاں ہے!..... طارق تُو کہاں ہے!...." پھر وُہ آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑانے لگتا اور یک لخت چلّا اٹھتا۔ "نہیں نہیں.... میں نہیں.... میں نہیں جانا چاہتا۔"

نرس نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور تسلّی دینے کی کوشش کی۔ "تمہیں کوئی نہیں بھیج رہا۔ تم آرام سے لیٹے رہو۔" لیکن بیچاری نرس کو کیا معلوم تھا کہ رحمت کہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ در اصل وہ کہہ رہا تھا میں مرنا نہیں چاہتا..... میں دُوسری دُنیا میں ابھی جانا نہیں چاہتا۔ یہی ایک سب سے بڑی فکر تھی۔ جو ہمیشہ رحمت کے سر پہ سوار رہتی تھی۔

پانچ دن تک رحمت موت اور زندگی سے لڑتا رہا۔ گھر میں ماں نے رو رو کر اپنی آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ کر لی تھیں۔ باپ بھی خاموشی سے رحمت کے بستر کے پاس کھڑا اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ رحمت کو کس چیز کے بارے میں زبردست فکر ہے۔

پانچ دن اِسی کش مکش میں گذر گئے۔ اب رحمت کو قدرے افاقہ تھا۔ دو دن بعد خطرہ رحمت کے سر پہ سے ٹل گیا۔

ایک شام جب رحمت کا باپ وارڈ میں داخل ہوا تو سسٹر نے مسکراتے ہوئے اُسے مبارک باد دی "بھائی صاحب اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے"

"سسٹر جی۔ یہ سب آپ کی مہربانی ہے"

رحمت نے آنکھیں کھول دی تھیں، اور اپنے باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بہت کمزور نظر آرہا تھا۔ اُس کا رنگ کافی حد تک زرد تھا۔ باپ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور آہستہ سے بولا "ابا جی، اب میں اچھا ہو رہا ہوں۔ آپ یہاں میرے پاس بستر پر بیٹھ جائیں"

"شکر ہے رحمت، تم اب خطرے سے باہر ہو۔ میں تو ہر روز تمہارے پاس آکر گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ کیا تمہیں کچھ یاد ہے؟" رحمت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "دو ایک دفعہ تو شاید میں نے آپ کو دیکھا تھا، لیکن ابا جی اُس وقت تو مجھے نا معلوم کیا ہو گیا تھا! نہ ہی کچھ نظر آتا تھا، نہ ہی کچھ سمجھ میں آتا تھا"

"اچھا بیٹے سنو" ابا نے پیار سے کہا "کل تمہاری امی جی اور بہنیں تمہیں دیکھنے آرہی ہیں۔ تمہاری امی کتنی خوش ہوگی جب میں اُسے یہ بتاؤں گا کہ تم اب بہت بہتر ہو اس نے تو رو رو کر اپنی جان آدھی کر لی ہے تمہاری بیماری کی وجہ سے اس کی حالت بھی بہت خراب ہو گئی تھی"

رحمت کو بڑی تسلی تھی کہ اس کا باپ اس کے نزدیک ہی بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے ابا کو بتا دے کہ بیماری کے دوران وہ کون سی بڑی فکر تھی جو اُسے بے حد تنگ کر رہی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کچھ سمجھ نہیں سکے گا۔ اس لیے وہ خاموش ہی رہا۔

دوسرے دن شام کو اس کی ماں، دونوں بہنیں اور چھوٹا فلپ اُسے ملنے آئے۔ ماں نے رحمت کو گلے سے لگایا اور کہا "رحمت تمہاری وجہ سے میں کتنی پریشان تھی۔" اُس نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پیار سے رحمت کے گالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

رحمت بھی سب کو دیکھ کر بڑا خوش تھا۔ بشیرہ، اور آستر پلنگ پر بیٹھ گئیں اور گھبرائی ہوئی نظروں سے وارڈ کے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔

آستر نے اپنے بھائی کے کان میں کہا "رحمت بھائی، کیا آپ کو اس جگہ ڈر نہیں لگتا تھا!"

بشیرہ نے ایک نرس کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ بھائی جان، وہ کون ہے۔ جس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں!"

لیکن ماں نے اُسے جھڑکا "چپ رہ بدتمیز" بچے خاموش ہو کر اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگے۔ ماں نے رحمت کے باپ کی طرف دیکھا اور کہا "اچھا ہوا کہ آپ عین وقت پر رحمت کو یہاں لے آئے۔"

فلپ پلنگ سے نیچے اُتر کر چاروں طرف چکر لگا رہا تھا۔ دو ایک مرتبہ تو وہ پلنگ کے نیچے بھی گھس گیا۔ اچانک اس کا سر زور سے میز سے ٹکرا گیا۔ اور وہ اُونچی آواز میں رونے لگا۔

ماں نے جھٹ اُسے گود میں اٹھا لیا۔ اور بہلانے لگی۔ اس نے اُسے دکھایا کہ رحمت کہاں لیٹا ہوا ہے۔

پھر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماں نے رحمت کو پیار کیا اور دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ کر کے سب چل دیئے۔

بہنوں نے بھی ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے بھائی کو خدا حافظ کہا۔ چلتے چلتے ماں نے کہا "بیٹے، دو چار دن کی بات اور ہے۔ پھر تمہیں گھر لے چلیں گے۔"

"ہاں امی جی، میں اب ٹھیک ہوں اور جلد از جلد گھر جانا چاہتا ہوں۔"

لیکن جو ڈاکٹر رحمت کا علاج کر رہا تھا۔ اُسے رحمت کے بارے میں اب تک کچھ فکر تھی۔ وہ اکثر دل میں کہتا۔ "نا معلوم کیا وجہ ہے کہ اس نوجوان کو جس طرح تندرست ہونا چاہیئے اس طرح وہ ہو نہیں رہا۔ کوئی تو ایسی بات ضرور ہے جو اس کی تندرستی میں حائل ہو رہی ہے۔ وہ نوجوان ہے۔ اب تک تو اُسے اٹھ کر چلنا پھرنا چاہیئے تھا لیکن وہ ابھی تک کمزور ہے اور ہر وقت خاموشی سے لیٹا رہتا ہے۔"

دوسرے دن دوپہر کے بعد دروازہ کھلا اور پہلا ملاقاتی وارڈ میں داخل ہوا۔ وہ ایک بوڑھا، سیدھا سادا اور رحمدل قسم کا انسان دکھائی دیتا تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا، اور دُبلا پتلا سا تھا۔ اس نے گھسی ہوئی خاکی رنگ کی پتلون اور نیلے رنگ کی قمیض پہن رکھی تھی، چہرہ ذرا لمبوترا سا تھا۔ اور لمبی سی ناک کی وجہ سے اور بھی لمبا معلوم ہوتا تھا اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی اور چھوٹی چھوٹی لیکن تیز آنکھیں یہ ظاہر کرتیں کہ وہ اپنی رُوح میں خوش رہنے والا انسان ہے۔ رحمت نے یہ بھی دیکھا کہ سوائے ایک جگہ چند سفید اور سیاہ بالوں کے اس کے سر پر بالکل بال نہیں تھے۔ یعنی وہ گنجا تھا۔ اُس نے پہلے سب مریضوں کی مزاج پرسی کی اور پھر کونے میں اپنے رشتہ دار کے پاس چلا گیا۔

غور سے رحمت انہیں باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے گھر کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ پھر اُس بوڑھے آدمی نے اپنا تھیلا کھولا۔ سیاہ رنگ کی ایک کتاب اور اپنی عینک نکالی۔ قمیض کے کنارے سے عینک صاف کر کے اسے لگایا اور کتاب کے ورق پلٹ کر کوئی خاص صفحہ ڈھونڈنے لگا۔ اُس نے کافی صفحے پلٹے اور وہ جگہ ڈھونڈ لی جہاں سے وہ پڑھنا چاہتا تھا۔

رحمت سُننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ وہ بزرگ اونچی آواز سے جو کچھ بھی پڑھ رہا تھا۔ اُس کا ایک ایک لفظ رحمت کے کانوں تک پہنچ رہا ہے۔

"میں اپنی آنکھیں پہاڑوں کی طرف اُٹھاؤں گا
میری کمک کہاں سے آئے گی؟
میری کمک خُداوند سے ہے
جس نے آسمان اور زمین کو بنایا۔
وہ تیرے پاؤں کو پھسلنے نہ دے گا۔
تیرا محافظ اونگھنے کا نہیں۔
دیکھ! اسرائیل کا محافظ
نہ اونگھے گا نہ سوئے گا
خُداوند تیرا محافظ ہے
خُداوند تیرے دہنے ہاتھ پر تیرا سائبان ہے۔
نہ آفتاب دن کو تجھے ضرر پہنچائے گا۔
نہ ماہتاب رات کو۔

خُدا وند ہر بلا سے تجھے محفوظ رکھے گا۔
وُہ تیری جان کو محفوظ رکھے گا۔
خُدا وند تیری آمد و رفت میں
اب سے ہمیشہ تک تیری حفاظت کرے گا۔"

(زبور نمبر ۱۲۱)

جب اُس بزرگ نے سارا زبور پڑھ لیا تو رحمت نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ اُس نے ایک ایک لفظ سُنا تھا اور اُس کا اس کے دل پر بڑا اثر ہوا تھا۔

اس نے بڑی چاہت سے اُس بُوڑھے شخص کی طرف دیکھتے ہُوئے دل میں کہا" یہ کتاب جس میں سے اُس نے پڑھا ہے ضرور خُدا کا کلام ہی ہوگا۔ کاش میں بھی اس شخص کی طرح ایسے ہی کہہ سکوں جس کے بارے میں ابھی ابھی باباجی نے پڑھا ہے۔"

اُس کے دل میں خیال آیا" اس شخص نے کس لیے اپنی آنکھیں اٹھائیں، کہ اُسے کہیں سے مدد حاصل ہو، اس شخص کو یہ پختہ یقین تھا کہ وُہ خُدا جس نے آسمان اور زمین کو بنایا ضرور اُس کی مدد کرے گا۔ اس شخص کا یہ بھی ایمان تھا کہ خُدا دن اور رات اُس کی حفاظت کرتا ہے۔"

رحمت اپنے بستر پر سیدھا لیٹا ہُوا تھا۔ اُس کی نظریں چھت پر گڑھی ہوئی تھیں اور وہ دل میں کہہ رہا تھا" کیا میں بھی یہ سب کچھ کہہ سکتا ہوں!" اُس نے پھر کروٹ بدلی اور باباجی کی طرف دیکھنے لگا۔ بار بار اس کے دل میں یہی سوال اٹھتا" کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی خُدا کو اس طرح جانے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی خُدا کو پیار کر سکے؟ اور اُس سے

بالکل نہ ڈرے ؟"
بابا نے بھی رحمت کی طرف دیکھا کہ وہ کس قدر مشتاق نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اُس نے اپنے رشتہ دار کے ساتھ دُعا کی اور پھر آہستہ سے اس کے کان میں کہا کہ وہ رحمت کے پاس جا کر اُس سے بھی بات چیت کرنا چاہتا ہے۔
ہاتھ میں بائبل تھامے باباجی رحمت کی طرف بڑھے۔ رحمت کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ بابا اس سے ملنے آ رہے ہیں۔
بابا بڑے پیار سے مسکرائے اور رحمت سے کہا " بیٹا سلام۔ خُدا تمہیں برکت دے۔"
" سلام باباجی" خوشی سے رحمت کی آنکھیں چمکنے لگیں " باباجی، وہ کرسی اِدھر گھسیٹ لیں اور بیٹھیں۔"
بابا نے کرسی اپنی طرف کھینچی اور اُس سے پُوچھا " بیٹا تمہارا نام کیا ہے"؟
اُس نے قدرے شرماتے ہُوئے کہا" میرا نام رحمت ہے۔"
" اور باباجی آپ کا کیا نام ہے"؟
" بیٹا، مجھے بابا لال کہتے ہیں۔ ہاں تو بیٹے رحمت، مجھے اب یہ بتاؤ کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔"
رحمت نے باباجی کو اپنے بارے میں اور اپنی بیماری کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ باباجی بڑے غور سے ساری باتیں سُن رہے تھے۔
" ارے واہ .... تم نے تو بڑا سخت وقت کاٹا ہے۔ لیکن خُدا کا

شکر ادا کرو کہ سب کچھ خیریت سے گذر گیا۔"

"خدا" کا لفظ سن کر رحمت کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "کیا میں بابا جی سے خدا کے بارے میں پوچھوں! لیکن اگر آج نہ پوچھا اور بابا چلے گئے تو پھر میں کس سے یہ سوال پوچھوں گا"!

وہ ابھی کوئی فیصلہ کرنے نہ پایا تھا کہ اس نے بابا کو یہ کہتے سنا "رحمت۔ تم تو ہمارے قریب ہی رہتے ہو۔ میں اچھرہ میں رہتا ہوں"۔ پھر بابا نے رحمت کو اپنے گھر کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ رہتے ہیں "میں بوڑھا ہوں لیکن شکر ہے کہ میں خود کما کر کھاتا ہوں"۔ بابا نے ہنستے ہوئے رحمت کو بتایا "میں مالی کا کام کرتا ہوں۔ جہاں میں کام کرتا ہوں وہ کوئی خاص بڑا چمن نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کوئی بڑی تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ میرے لیے کافی ہے۔ مجھے اپنے باغ سے بڑی محبت ہے۔"

رحمت نے اس سیاہ رنگ کی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "بابا جی۔ یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے یہ بائبل ہے"؟

"ہاں بیٹا"۔ یہ خدا کا مقدس کلام ہے یہی وہ مقدس خزانہ ہے جو مجھے میرے والدین کی طرف سے ملا ہے۔ میرے ماں باپ پر بھی بڑا مشکل وقت آیا تھا لیکن اس پاک کلام سے انہیں ہمیشہ بڑی تسلی ملی اور وہی پکا ایمان میرے ماں باپ نے اپنی اولاد کو بھی دیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے مجھ کو دل کا سکون اور چین ملتا ہے۔ کیونکہ اس کے وسیلے سے خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ اداس ہوں تو اسی سے مجھے تسلی ملتی ہے۔ جب کوئی برائی کرتا ہوں تو یہی کلام مجھے ملامت کرتا ہے۔"

رحمت نے ہنستے ہوئے کہا "آپ اور برائی؟"
بابا کو ہنسی آگئی اور وہ کہنے لگے "ارے تم تو مجھے بہت اچھا سمجھنے لگ گئے ہو" لیکن ایک دم سنجیدہ ہو کر بولے "بائبل ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ ہر انسان برا ہے بلکہ یہ تو اس کی فطرت ہے"
رحمت اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور بڑا حیران نظر آنے لگا "بابا جی جو کچھ آپ نے ابھی پڑھا تھا اس کا میں نے ایک ایک لفظ سنا تھا جو کچھ آپ پڑھ رہے تھے وہ بے حد شیریں اور تسلی سے بھرپور باتیں تھیں۔ کاش میں بھی یہ کہہ سکوں کہ خدا میرا مددگار ہے اور وہ میری رکھوالی کرتا ہے۔ میں اگرچہ مسیحی ہوں لیکن میں یہ باتیں اپنے متعلق نہیں کہہ سکتا۔ میں تو خدا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا، مجھے تو اس بات سے ڈر لگتا ہے"
بابا لال سر جھکائے بڑے غور سے سن رہے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ بھی رحمت کی بات نہ کاٹی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ خاموشی سے سنتے رہے تو وہ لڑکا اپنے دل کا سارا درد اور دماغ کا سارا بوجھ ہلکا کر سکے گا۔ اس لیے وہ بالکل خاموش رہے۔
رحمت بھی خوش تھا کہ بابا بڑی ہمدردی سے اس کی باتیں سن رہے ہیں اس نے پھر کہا "جب میں بیمار تھا تو بس ایک ہی خوف میرے ذہن پر چھایا ہوا تھا کہ اب میں مر جاؤں گا۔ بس بار بار یہ سوال میرے دماغ میں آتا رہا۔ مرنے کے بعد میرے ساتھ کیا ہوگا؟ میں کہاں جاؤں گا؟ یہ خیال مجھے اور بھی ستاتا تھا۔ کہ اگر واقعی خدا کہیں ہے تو موت کے بعد میں ضرور اس کے سامنے پیش کیا جاؤں گا۔ میں یہ جانتا

ہوں کہ خدا مجھ سے خوش نہیں ہے۔ وہ ضرور مجھے اپنے پاس سے باہر نکال دے گا۔ تب میرا کیا ہوگا؟ دن رات یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔"

بابا لالی نے بائبل کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا "بیٹا میرا ایمان ہے کہ خدا نے تمہیں اسی طرح بلایا ہے اور وہ تمہیں تیار کر رہا ہے کہ تم دل سے اس پر ایمان لاؤ اور اپنی زندگی میں اور اپنے دل میں اسے جگہ دو۔"

رحمت نے مشکوک نگاہوں سے اپنے مہمان کی طرف دیکھا "بتائیں بابا جی۔ کیا واقعی خدا ہے؟ کیا یہ جاننے کا کوئی یقینی راستہ ہے کہ وہ واقعی ہے۔"

"ہاں میرے بیٹے، ہم مکمل طور پر یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ وہ واقعی ہے۔"

"تو پھر وہ اپنے آپ کو ظاہر کیوں نہیں کرتا، تاکہ ہم اسے دیکھ کر اس پر پکا ایمان لے آئیں"؟ رحمت نے بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹے خدا نے کئی طریقوں سے اپنے آپ کو اپنے بندوں پر ظاہر کیا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو کئی آدمیوں پر ظاہر کیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کو اس دنیا میں بھیجا کہ وہ یہاں پیدا ہو اور اس دنیا میں رہے۔ وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوا، اس لیے وہ جانتا ہے کہ غریبی کا کیا مطلب ہے اس نے بڑھئی کا کام کیا۔ اور جب مقررہ وقت پورا ہوا تو فلسطین ملک کے گرد و نواح میں جہاں وہ رہتا تھا، گھوما پھرا اور ہر جگہ لوگوں کو خدا اور خدا کی بادشاہی

کے بارے میں بتایا۔ اس نے غمزدہ لوگوں کو خوشی عنایت کی۔ بیماروں کو صحت بخشی۔ لیکن پھر بھی لوگوں نے اُس سے نفرت کی۔ وہ لوگ یہودی سردار تھے۔ وُہ اس شخص سے بہت جلتے تھے اور حسد کرتے تھے کہ وہ کیوں لوگوں کے سامنے خُدا کی منادی کرتا ہے۔ آخر میں انہوں نے اُسے مار بھی دیا۔ ہاں اُنہوں نے خُدا کے بیٹے کو صلیب پر چڑھا کر مار ڈالا۔"

رحمت کا مُنہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ وہ بولا۔" بابا جی، جو کچھ کہہ رہے ہیں، کیا وہ سب سچ ہے؟ جو کچھ بائبل میں لکھا ہے، کیا وہ سب درست ہے؟"

" بالکل۔ بالکل۔ وُہ زندہ خُدا ہے اور وہ ہم سے بات چیت کرتا ہے۔" بابا نے اور زیادہ سمجھانے کے لیے رحمت سے کہا۔" فرض کرو۔ اندھیری رات ہے۔ تم گھر میں ہو تمہیں باہر صحن میں کسی کے چلنے کی آہٹ سُنائی دیتی ہے تم دل میں سوچنے لگتے ہو" یہ کون ہو سکتا ہے؟ پھر تمہیں یاد آتا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ابّا اٹھ کر باہر گئے تھے۔ یہ ضرور ابّا ہی ہوں گے۔ لیکن اپنے شک کو دُور کرنے کے لیے کہ باہر ابّا ہی ہیں، تم آواز دیتے ہو۔ ابّا جی، آپ ہی ہیں"؟ پھر تم جواب کا انتظار کرتے ہو۔ باہر سے ایک جانی پہچانی بھاری سی آواز آتی ہے۔" بیٹے میں ہی ہوں۔" آواز سنتے ہی تمہارا شک دور ہو جاتا ہے اور تمہیں یقین ہو جاتا ہے کہ ابّا جی ہی باہر ہیں تم نے اُٹھ کر اپنی آنکھوں سے تو دیکھا نہیں۔ تمہیں آواز سے ہی یقین ہو گیا کہ باہر ابّا ہی ہیں۔"

یہی خُدا کے بارے میں بھی سچ ہے۔ جب ہم اُسے پکارتے ہیں

تو وُہ اپنے آپ کو ہم پر ظاہر کرتا ہے وہ ہماری بات کا جواب دیتا ہے تاکہ ہم اُس پر پُورا پُورا بھروسہ رکھ سکیں۔ سچے مسیحی اور حقیقی ایماندار بننے کے لیے یہی پہلا قدم ہے۔"

رحمت کی آنکھیں باباجی کے ہلتے ہوئے لبوں پر جمی ہوئی تھیں۔ وُہ پکار اٹھا "باباجی، خدا آپ کے لیے کتنی صاف اور واضح حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ مجھے خُدا کے بارے میں اور بھی بتائیں۔"

بابا لال اپنی بائبل کھولنے والے تھے کہ کوئی وارڈ میں داخل ہُوا۔ یہ رحمت کا والد تھا۔ اس لیے بابا اٹھ کھڑے ہُوئے "بیٹے۔ خُداوند نے زندگی دی تو میں کل پھر آؤں گا، اور ہاں یاد رکھو کہ خُدا تم میں کام کر رہا ہے، وہ تمہیں مکمل طور پر جیت لینا چاہتا ہے وہ تمہیں خوشی اور خرمی دینا چاہتا ہے، میرے بیٹے۔" یہ کہہ کر بابا چل دیئے۔

رحمت نے پیچھے سے آواز دی "باباجی۔ کل ضرور آئیے۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

وارڈ میں اب بہت سے رشتہ دار اور مزاج پرسی کرنے والے آ چُکے تھے۔ کسی کی ماں، کسی کے جھوٹے بھائی بہن۔ ایک مریض کے پاس ایک مولوی صاحب بیٹھے تھے۔ ایک اور آدمی اپنی چادر میں گنڈیریاں باندھے چلا آ رہا تھا۔ اب کافی رونق ہو چکی تھی کبھی کبھی زور سے ہنسنے کی آواز بھی آتی۔

رحمت کے ابّا نے پلنگ پر بیٹھتے ہی پُوچھا "آج کیسی طبیعت ہے میرے بیٹے کی"؟

رحمت نے باپ کے ہاتھ کو زور سے دبایا اور کہا "ابا جی، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے گھر لے چلیں۔"

"ہاں ہاں بیٹے ضرور ..... اب تو تم بالکل تندرست نظر آرہے ہو۔ یہ کرسی یہاں کس نے رکھی ہے۔ تمہیں کوئی ملنے آیا تھا؟"

"ہاں۔ لیکن در اصل بابا لال خاص مجھے ہی ملنے نہیں آئے تھے۔ ان کا تو اس کونے والے پلنگ پر ایک رشتہ دار بیمار ہے۔ جاتے جاتے وہ دو گھڑی میرے پاس رُکے۔ اور ابا جی .... ابا جی ان کے پاس بائبل بھی تھی!!! انہوں نے اس میں سے مجھے پڑھ کر بھی سُنایا!!!"

"ٹھیک ہے ... ٹھیک ہے۔" والد نے ابا سی لیتے ہوئے کہا۔ "اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ بابا لال نے رحمت کو کیا پڑھ کر سُنایا تھا۔

یہ دیکھ کر رحمت کو بڑی مایوسی ہوئی کہ اس کے باپ نے ذرا بھر دلچسپی نہ دکھائی تھی۔ شاید اُس وقت والد کو بھی اس چیز کا کچھ احساس ہُوا اس لیے اس نے باتوں کا رخ موڑا۔ ایک دم کچھ کیلے اور سنگترے میز پر رکھے اور کہا "بیٹا یہ تمہارے لیے ہیں۔ خوب کھاؤ اور جان بناؤ سب تمہارے گھر آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

رحمت نے پھل دیکھ کر کہا "کتنے بڑے بڑے سنگترے ہیں۔ ابا جی، میں بعد میں یہ کھاؤں گا۔"

ابا نے اس کی بغل میں گدگدی کرتے ہوئے کہا "اب کبھی یہ نہ کہنا کہ بھوک نہیں ہے۔ بس اب جلدی جلدی گھر آنے کی تیاری کرو۔ ہاں رحمت درزی صاحب نے بھی تمہارا حال پوچھا ہے اور سلام کہا ہے۔ اُسے تمہارا بے حد خیال رہتا ہے وہ دکان سے اٹھ کر باہر آیا اور مجھے ٹھہرا کر تمہارا حال پوچھا۔"

"ابا جی۔ درزی بہت ہی نیک اور شریف انسان ہے۔ میں اُس کی

نیکی کبھی نہیں بھول سکتا۔ جس دن میں بیمار تھا، اُس دن اُس نے میری بڑی مدد کی تھی۔ ابا جی کل آپ ضرور اُسے میرا سلام دیں۔"

چھ بج چکے تھے۔ بیرا نے گھنٹی بجائی اور لوگ وارڈ سے باہر جانا شروع ہو گئے۔ رحمت کا باپ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر چل دیا۔ اب ڈیوٹی والی نرسیں آگئیں انہوں نے بخار دیکھا دوائی دی۔ اس کے بعد کھانا آگیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد تھوڑی دیر چلنے پھرنے کی آواز آتی رہی۔ آہستہ آہستہ بالکل خاموشی چھا گئی۔ مریض گہری نیند سو گئے۔

رحمت آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کل بابا لال بھی آئیں گے۔ اُسے یہ سوچ سوچ کر بڑی تسلی ہوئی کہ بابا جی سے خدا کے بارے میں اور باتیں کرے گا۔ اور بابا جی اُسے بائبل میں سے پڑھ کر سنائیں گے۔ نہ جانے کیوں اُسے امید ہونے لگی کہ آخر وہ بھی خدا کو پہچان لے گا اور اس پر پورا ایمان رکھ سکے گا۔

ساتواں باب

دوسری صبح جب مریض بیدار ہوئے تو وُہ بہت خوش اور تازہ دم نظر آتے تھے۔ رات کو سخت گرمی تھی لیکن صبح صبح ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شاید کہیں نزدیک ہی بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے موسم بڑا خوشگوار تھا۔

رحمت کی آنکھ کھل چکی تھی۔ وُہ پرندوں کے چہچہانے کی آواز سُن رہا تھا۔ اتنے میں کسی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ ایک رکشا ہارن بجاتا ہُوا تیزی سے جاتے سُنائی دیا۔

ہسپتال میں پھر رونق شروع ہوگئی تھی۔ ڈیوٹی والی نرس نے مریضوں کا بخار دیکھا اور نبض گن کر چارٹ پر لکھی۔

ذرا دور بچّوں کے وارڈ سے ایک بچّے کے چیخنے کی آواز آئی۔ شاید اُسے سُوئی لگائی جا رہی تھی۔ ساتھ والے وارڈ میں بھی مریض بول رہے تھے۔

دن والی سسٹر نے جو بڑی ہنس مکھ تھی اپنی مخصوص آواز میں کہا "ناشتے کے لیے کون کون تیار ہے"۔

ایک مریض نے جواب دیا "ناشتہ ملے گا بھی یا آج روزہ ہوگا؟"
سب ہنس دیئے۔ باہر گلاسوں اور پلیٹوں کے ٹکرانے کی آواز آرہی تھی۔
واقعی ناشتہ تیار تھا۔ اتنے میں بیرا کیتلی اُٹھائے اندر آیا۔ دوسرے
نے ڈبل روٹی اٹھائی ہوئی تھی۔ سب کے گلاسوں میں چائے ڈال دی
گئی اور آدھی آدھی ڈبل روٹی دی گئی۔ بیس منٹ تک ہر طرف منہ چلانے
کی یا چائے پینے کی آواز آتی رہی۔

دوائی وغیرہ پی لینے کے بعد سب مریض آرام سے لیٹ گئے
انہیں سوائے آرام کرنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ ہسپتال میں کام
کی تیاری شروع ہو چکی۔ اپریشن کمرہ تیار تھا۔ باہر کے مریض تانگوں
ٹیکسیوں یا رکشوں میں بیٹھ کر آرہے تھے اور خاموشی سے ہال کمرے
میں لمبی لمبی بنچوں پر بیٹھتے جارہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب آنے ہی والے
تھے۔

رحمت کی آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر جاگ اٹھا۔ دل
میں یہی خیال تھا کہ آج وقت گزر ہی نہیں رہا ہے۔ وہ بڑی بیتابی سے
بابا لال کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن ابھی تو دس ہی بجے تھے۔ بابا جی تو
چار بجے آئیں گے۔

اُس نے گردن اُٹھا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ سامنے والے پلنگ
پر اٹھارہ سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ وہ رحمت کو بیدار دیکھ کر
اُس کے پاس آگیا۔ اُسی کے پلنگ پر پاؤں اُوپنچے کر کے بیٹھ گیا اور
کہا "کیسی طبیعت ہے"؟

رحمت بھی اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہا "مہربانی۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں"۔

"تمہارا نام رحمت ہے نا؟ پرسوں تمہاری بہن نے یہی نام لیا تھا۔"
رحمت نے سر ہلایا اور کہا "ہاں میرا نام رحمت ہی ہے اور آپ کا کیا نام ہے؟"
"میرا نام فرید ہے۔ مجھے آج چھٹی مل جائے گی اور میں شام کو اپنے گھر چلا جاؤں گا۔"

رحمت کو اُس پر بڑا رشک آیا۔ فرید کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔ "بڑے خوش قسمت ہو۔ کاش میں بھی آج ہی گھر جا سکوں۔ فرید آپ کو کیا تکلیف ہو گئی تھی؟"

فرید نے اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہُوئے کہا "میرا "اپینڈے سائٹس" کا اپریشن ہُوا تھا۔ اُف توبہ۔ کس قدر درد تھا مجھے!!! اور وہ بھی اچانک ہی ہُوا۔ میں کپڑے کی ایک مل میں کام کرتا ہوں۔ صبح میں معمول کے مطابق کام پر گیا۔ کوئی گیارہ بجے میرے پیٹ میں درد شروع ہُوا۔ پہلے تو میں نے سوچا، معمولی درد ہے۔ آپ ہی آرام آ جائیگا لیکن درد بڑھتا ہی گیا۔ دو گھنٹے بعد تو درد کے مارے میری چیخیں نکل گئیں۔ پہلے تو میرے ساتھی میرا مذاق اڑاتے رہے۔ وہ یہی کہتے رہے کہ میں بہانہ بنا رہا ہوں۔ لیکن جب میری حالت بہت خراب ہو گئی تو وہ مجھے ہسپتال لے آئے۔"

پھر فرید نے رحمت پر گدگداتے ہُوئے کہا "مجھے ڈاکٹر نے دیکھا اور جب میں نے یہ سُنا کہ ڈاکٹر نے ایک دم اپریشن کرنے کے لیے کہا تو میری تو جیسے نانی مر گئی۔"

فرید زور سے ہنس پڑا لیکن رحمت نے سنجیدگی سے پُوچھا "فرید یہ

اپریشن کیسے کرتے ہیں؟ جب اُنھوں نے تمہارا پیٹ کاٹا تو تمہیں درد نہیں ہُوا؟"

فرید ہنس پڑا۔ "نہیں، بالکل نہیں۔ وہ تو پہلے مریض کو بے ہوش کر دیتے ہیں اور پھر اپریشن کرتے ہیں۔"

رحمت نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "میں تو کبھی اپریشن نہ کراؤں گا۔ مجھے تو اپریشن کے نام ہی سے خوف آتا ہے۔"

"جی جی۔ ٹھیک کہتے ہو۔" فرید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن جب تم درد کے مارے مر رہے ہو اور اُس درد کا علاج صرف اپریشن ہو، تب تو بھائی صاحب تم بکری کی طرح خاموشی سے اپریشن کروانے چلے آؤ گے۔"

رحمت نے کچھ سوچ کر صرف اتنا کہا۔ "ہوں... شاید..." اِتنے میں فرید جلدی سے نیچے اترا۔ چپلی پہنی اور تیزی سے دفتر کی طرف جاتے ہوئے بولا

"لو.... میرے ابّا مجھے گھر لے جانے کے لیے آگئے ہیں۔ اُمید ہے رحمت تم بھی جلدی گھر چلے جاؤ گے۔"

گھڑی نے بارہ بجائے۔ پھر ایک بجا۔ پھر دو بجے۔ رحمت کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ اُٹھا تو ساڑھے تین بج چکے تھے۔ چند رشتہ دار وارڈ میں آئے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلا اور بابا لال مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ اُنھوں نے ہاتھ ہلا کر رحمت کو سلام کیا اور بلند آواز میں بولے۔ "رحمت بیٹے پانچ منٹ میں آیا۔"

رحمت بھی جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا سر جُھکا کر سلام کا جواب دیا اور بابا جی کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔

بابا لالؔ نے ایک سٹول اپنے رشتہ دار کے پلنگ کے پاس کھینچا اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پندرہ منٹ کے بعد انہوں نے اپنے تھیلے میں سے بائبل نکالی۔ عینک لگا کر پڑھنا شروع کی۔

رحمتؔ اپنے پلنگ پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ بے صبری سے منتظر تھا کہ کب بابا جی اس کے پاس آئیں۔ آخر بابا جی اُٹھے اور ایک منٹ خاموش کھڑے رہے اور پھر رحمتؔ کی طرف چل دیئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اُنہوں نے پوچھا "کیسی طبیعت ہے آج ہمارے بیٹے کی؟"

رحمتؔ نے بڑے ادب سے جواب دیا "بابا جی۔ مَیں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بیٹا رحمتؔ۔ کل میں ایک بات تم سے پوچھنا بھول گیا تھا۔ کیا کروں، بوڑھا ہو گیا ہوں، جلدی بھول جاتا ہوں..... کیا تم پڑھ سکتے ہو؟"

جب رحمتؔ نے جواب دیا تو اس کی آواز میں بڑی خوشی تھی۔ "جی بابا جی۔ میں تھوڑا تھوڑا پڑھ سکتا ہوں۔ بعض مشکل لفظ میں نہیں پڑھ سکتا۔ لیکن آسان اور سادہ کہانیاں پڑھ لیتا ہوں مَیں نے ابھی ابھی پڑھنا سیکھا ہے۔ سارا دن تو کام کرتا تھا اور شام کو ایک دوست سے پڑھتا تھا۔ اسی لیے بہت ترقی نہ کر سکا۔"

بابا نے خوش ہو کر کہا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آج میں تمہارے لیئے انجیل کی ایک جلد لایا ہوں۔ یہ کچھ چھوٹی سی ہے۔ بچپن میں مَیں یہی پڑھا کرتا تھا۔ اب چونکہ میرے پاس بائبل ہے اس لیے مَیں

تمہیں یہ پڑھنے کو دے سکتا ہوں۔" بابا جی نے اپنے تھیلے میں سے نیا عہد نامہ نکالا اور رحمت کو دیا۔ "تو میرے بیٹے۔ اسے بڑے دھیان سے پڑھو تمہیں بڑی برکت ملے گی۔"

رحمت نے رُکتے رُکتے بابا جی کا شکریہ ادا کیا۔ بڑی عزت سے نیا عہد نامہ لیا اور اُس کے ورق پلٹنے لگا۔

"اب میں تمہیں خدا کے بارے میں اور کچھ بتاؤں گا۔" بابا نے کرسی رحمت کے اور نزدیک کھینچ لی۔ "اور یہ بھی بتاؤں گا کہ ہم کیسے خدا کے فرزند بن سکتے ہیں بیٹے یہ جان لو کہ خدا کے فرزندوں کو اپنے آسمانی باپ سے ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آسمانی باپ کو پیار کرتے ہیں اور اُسے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا ان کی رہنمائی کرتا ہے اور عمر بھر ہر وقت ان کی مدد اور حفاظت کرتا ہے۔"

رحمت نے اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکائی اور بڑے غور سے بابا جی کی طرف دیکھا۔ "آپ تو بڑی عجیب باتیں بتا رہے ہیں۔ میں نے تو پہلے کبھی ایسی باتیں نہیں سُنی ہیں۔ بھلا کوئی خدا کا فرزند کس طرح بن سکتا ہے؟"

بابا لال نے بائبل اپنے ہاتھوں میں لی۔ اور پہلا صفحہ کھول کر کہا۔ "بیٹے یہ بائبل کا پہلا صفحہ ہے۔ یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ پہلے یہ زمین جس میں ہم رہتے ہیں۔ بالکل تاریک اور سنسان تھی۔ لیکن خدا نے یہاں روشنی بنائی اور اُسے خوبصورت بنا دیا۔ اس نے پھول خوش نما درخت اگائے۔ پھر سورج چاند اور ستارے بنائے۔ لیکن یہ پھر بھی مکمل نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایسی چیزیں بنائے جن میں زندگی ہو اور جو چلیں اور پھریں۔ اس نے چمک دار مچھلیاں بنائیں اور انہیں سمندریں اور دریاؤں میں رکھا اس نے بڑی بڑی

وہیل مچھلیاں اور طرح طرح کے جانور بنائے جو پانی ہی میں رہتے ہیں۔ یہ سب تو بہت ہی خوب صورت تھا لیکن اب تک زمین اور فضا خالی تھی۔ اس لیے خدا نے پرندے بنائے کہ وہ ہوا میں اڑیں۔ ہرے ہرے طوطے، رنگ برنگے پرندے۔ چیل، کوّے، باز اور شکرے بنائے اور فضا ان سے بھر گئی۔ لیکن ابھی بھی کھیت اور زمین غیر آباد سی نظر آتی تھی۔ پہاڑ اور جنگل خالی خالی سے تھے۔ چنانچہ خدا نے ہاتھی، گھوڑے، شیر، بکریاں، گائے، بیل، بلی، کتے یعنی ہر قسم کے جانور اور چوپائے بنائے۔ اب زمین آسمان خشک تری، ندی نالے، سمندر دریا سب جاندار چیزوں سے بھر گئے۔ لیکن اب بھی خدا کو پوری تسلی نہیں تھی اس لیے اس نے پہلے مٹی سے ایک آدمی بنایا۔ اس میں جان ڈالی اور پھر عورت کو بنایا کہ آدمی کی ساتھی بنے۔"

تب رحمت بول اٹھا "ہاں، میں نے یہ بات سنی ہے۔ اس آدمی کا نام آدم تھا اور عورت کا نام حوّا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں۔ تم نے ٹھیک کہا۔ اب آگے سنو۔ جب خدا انہیں بنا چکا تو اس نے انہیں ایک بڑے خوبصورت باغ میں رکھا۔ جو اس نے خاص اس کے لیے ہی بنایا تھا۔ اس باغ میں آدم اور حوّا بہت خوش تھے۔ وہ کبھی بیمار نہ ہوتے نہ ہی ان کے سر درد ہوتی، نہ ہی انہیں کبھی بخار ہوتا۔ اس باغ میں شیر اور چیتے بھی تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی ان پر حملہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو پالتو کتوں کی طرح ان کے پاس آتے تھے۔ جب آدم اور حوّا پیار سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے تو وہ ان کے پیروں میں لوٹنے لگتے۔ اور پیار سے خُر خُر کرتے۔ وہ دونوں بہت ہی خوش تھے۔ اور خاص طور پر اس لیے کہ خدا خود ان کے پاس آتا۔ اور ان سے باتیں کرتا تھا۔ وہ دونوں خدا کو اپنا باپ جانتے تھے۔"

"اسی باغ کے درمیان ایک درخت تھا، جس کے بارے میں خدا نے انہیں صاف صاف حکم دیا تھا۔ کہ کبھی اس کے نزدیک نہ جانا۔ خدا نے کہا وہ چاہتا ہے کہ آدم اور حوا دونوں خدا کا حکم مانیں کیونکہ جس دن بھی انہوں نے خدا کے حکم کو توڑا اور اس درخت کا پھل کھایا تو اسی دن وہ دونوں مر جائیں گے۔ اُن دونوں نے خدا سے کہا۔۔۔۔ نہیں نہیں، یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم اس درخت کے نزدیک جائیں۔ باغ میں اور کئی قسم کے درخت ہیں اور وہ پھلوں سے لدے ہوئے ہیں ہم کبھی بھی اس درخت کے نزدیک نہیں جائیں گے اور نہ ہی اس کے پھل کو ہاتھ لگائیں گے۔"

رحمت بڑے غور سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ اب اس نے باجی کی بات کاٹی اور پوچھا "باجی، یہ کس قسم کا جادو کا درخت تھا۔ جس کے پھل کو نہ کھانے کی خدا نے ہدایت کی تھی۔"

"نہیں نہیں بیٹا، یہ جادو وادو کا درخت نہیں تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے خدا کی یہ مرضی تھی کہ وہ دونوں اس کا حکم مانیں۔ خدا نے ان سے کوئی بہت بڑا کام کرنے کو کہا نہیں تھا۔ ٹھیک ہے نا۔۔۔۔ اچھا تو پھر کیا ہوا کوئی اور بھی تھا جو ان سب باتوں کو دیکھ دیکھ کر سخت حیران و پریشان ہو رہا تھا۔ جب خدا نے زمین بنائی تو وہ دل میں کہنے لگا "بھلا اس خوبصورت زمین کے بنانے کی کیا ضرورت تھی"۔ جب خدا نے پرندے اور چرندے بنائے تو وہ اور بھی جل گیا کہ یہ کیوں بنائے گئے ہیں۔ وہ اس بات سے سخت ناراض تھا کہ خدا نے ایسی پیاری پیاری چیزیں بنائیں اور وہ ان سے خوش ہے اور پھر جب خدا نے آدم اور حوا کو بنایا تو اس شخص کا تو جل بھن کر بُرا حال ہو گیا۔ اُس نے اپنے دل میں پکا عہد کر لیا کہ وہ

ان سب چیزوں کو خراب کر دے گا۔ یہ اُس کی برداشت سے باہر تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ آدمؑ اور حوّاؑ سے خُدا خوش ہے۔ اُن سے ملنے کو آتا ہے اور وہ دونوں خُدا کی نزدیکی میں رہتے ہیں۔"

"معلوم ہے وہ بُرا شخص کون تھا؟ وہ ابلیس تھا۔ جو حد سے زیادہ چالاک اور مکّار تھا۔ ایک دن وہ سانپ کے بھیس میں آیا۔ اُس نے دِل میں کہا "چلو آدمؑ اور حوّاؑ سے دوستی گانٹھیں۔ جب وہ مجھ سے بولنے لگ جائیں گے تو مَیں انہیں صلاح دوں گا۔ کہ وہ اُس درخت کا پھل کھائیں جس کا پھل کھانے سے خُدا نے انہیں منع کیا ہے اگر وہ میری بات مان گئے۔ اور انہوں نے درخت کا پھل کھا لیا۔ تو پھر جیت میری ہوگی۔ اور نافرمانی کی وجہ سے خُدا انہیں سخت سزا دے گا۔"

"ابلیس ایک بڑے ہی خوبصورت رنگ کے سانپ کی شکل میں حوّاؑ کے پاس گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے پُوچھا "کیا واقعی خُدا نے تمہیں سارے باغ کے درختوں کا پھل کھانے سے منع کیا ہے؟"

حوّاؑ سانپ کے اس عجیب و غریب سوال پر غور کرنے لگی "نہیں خُدا نے تو ہمیں صرف ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کیا ہے۔"

"سانپ لہراتا ہوا حوّاؑ کے نزدیک گیا تاکہ وہ غور سے اُس کی باتیں سُن سکے۔ حوّاؑ نے اُسے بتایا" خُدا نے ہمیں اُس درخت کے بارے میں سختی سے منع کیا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہم اُسے چھُو بھی لیں۔ اُس نے صاف کہا ہے کہ اگر تم اُس کے نزدیک بھی گئے تو مارے جاؤ گے۔"

"سانپ بڑا حیران ہُوا" مارے جاؤ گے!!! نہیں نہیں نہیں۔ اس کا بالکل یقین نہ کرو۔ اُس درخت کے بارے میں خُدا کبھی اتنا سخت حکم نہیں دے

سکتا۔ ذرا دیکھو تو۔ وہ درخت کس قدر خوبصورت ہے اور اس کا پھل!!! واہ واہ کتنا مزیدار اور رسیلا ہوگا۔"

رحمت سانس روکے یہ بیان سُن رہا تھا۔ بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکلا "ہائے.... کیا حوّا نے اس موذی ابلیس کی صلاح تو نہیں مان لی!"

"ہاں بیٹے۔ حوّا ابلیس کی بات مان ہی گئی۔ اس نے اس درخت کا پھل توڑا اور کھا بھی لیا۔ یہی نہیں، اُس نے آدم کو پھل دیا اور اُس نے بھی وہ پھل کھا لیا۔"

"توبہ توبہ.... یہ اُن دونوں کے لیے کس قدر بُرا دن تھا۔ لیکن ابلیس خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔ اس کی جیت ہوگئی تھی۔"

"اب ان دونوں کو اُس چیز کا احساس ہُوا کہ اُنہوں نے ایک بہت ہی غلط کام کیا ہے۔ ان کی زندگی میں یہ پہلا دن تھا۔ جب وہ سخت اداس اور پریشان ہو رہے تھے۔ اب انہیں خدا سے ڈر لگنے لگا اور انہوں نے اپنے آپ کو خدا سے چھپایا۔"

"جب خدا ان سے ملنے آیا تو وہ اُس سے خوشی خوشی ملنے کے لیے تیار نہ تھے۔ خدا کو بہت ہی زیادہ رنج ہُوا کیونکہ وہ ایکدم سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہُوا ہے۔ اس نے زور سے آواز دی "آدم تُو کہاں ہے؟"

"اب ڈرتے اور کانپتے ہوئے وہ اُس جگہ سے باہر نکل آئے جہاں چھپے ہوئے تھے۔ خدا نے بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "چونکہ تم نے میری نافرمانی کی ہے۔ اس لیے تم اب میرے نزدیک نہیں رہ سکتے۔ تمہیں اب یہ باغ چھوڑنا ہوگا۔ اور تم باہر جا کر رہو گے۔ اب سے تمہیں اپنی روزی کمانے کے لیے سخت محنت اور مشقت کرنی ہوگی۔

اب تم پر سخت دکھ تکلیف اور بیماری آیا کرے گی۔ اور تمہارا انجام موت ہوگا لیکن میں تمہیں صرف ایک تسلی دے سکتا ہوں کہ بہت مدت کے بعد میں کسی کو بھیجوں گا۔ جو تمہیں اُن غلط راستوں سے ہٹائے گا جن پر تم چلنے لگے ہو۔ وہی شخص بنی نوع انسان کے لیے ایک مرتبہ پھر آسمان کے دروازے کھولے گا۔ کہ وہ وہاں داخل ہو سکیں۔"

رحمت نے پھر ٹھنڈی سانس لی اور کہا "کاش وہ اُس موذی سانپ کی بات نہ سنتے۔ اگر وہ پھل نہ کھاتے تو باغ میں وہ کس قدر آرام کی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ خدا تو بالکل اُن کے باپ کی مانند تھا نا..... وہ تو ان سے بہت پیار کرتا تھا۔ اور ان کی کتنی فکر کرتا تھا۔ لیکن بابا جی میں ایک بات نہیں سمجھ سکا کہ خدا نے انہیں اس قدر سخت سزا کیوں دی؟ وہ تو سب سے بڑا ہے۔ ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا؟ اگر وہ اُن سے یہ کہتا..... سنو آدم و حوا۔ تم نے غلط کام کیا ہے۔ اس دفعہ تو میں تمہیں معاف کرتا ہوں لیکن خبردار پھر ایسا کام نہ کرنا۔ کیا یہ خدا نے اچھا کیا کہ اُس نے انہیں اتنی سخت سزا دی اور ان کی زندگی برباد ہوگئی؟ انہوں کوئی اتنا بھاری جرم تو نہیں کیا تھا کہ انہیں خدا اتنی سخت سزا دیتا۔"

بابا نے بائبل میں انگلی رکھ کر اُسے بند کرتے ہوئے کہا "یہ تو تم اُس طرح سوچتے ہو۔ لیکن خدا نے تو انہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا اور صاف صاف بتا دیا تھا کہ جس دن تم اس درخت کا پھل کھاؤ گے اُسی دن مر جاؤ گے۔ نافرمانی خدا کی نظر میں کوئی چھوٹا سا قصور نہیں ہے۔ یہ تو بہت بڑا جرم ہے بالکل ایسا جیسے چوری، قتل یا ڈاکہ مارنا۔"

رحمت نے اپنے پاؤں پلنگ سے نیچے لٹکا دیئے اور انہیں آگے پیچھے

حرکت دینے لگا۔ وہ گہری سوچ میں تھا۔ "میں نے تو کبھی ایسا خیال نہیں کیا۔"
پھر بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بابا جی، ذرا سوچیں ہم دن بھر میں کتنی دفعہ جھوٹ بول لیتے ہیں۔ سب ہی جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن میں نے آج تک یہ خیال نہیں کیا تھا کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے۔"

بابا نے بھی سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں رحمت، آدم اور حوا کے لیے یہ بہت ہی سخت سزا تھی۔ لیکن یہ سزا اُن کے بچوں کے لیے بھی تھی اور اُن سب کے لیے بھی جو اس روئے زمین پہ پیدا ہوں گے۔"

تب تو رحمت نے بڑی گرمجوشی سے کہا۔ "یہ کیا!!! بابا جی، یہ تو بہت بڑا ظلم ہے!!!"

"ہاں بیٹے۔ جو انسان پہلی دفعہ یہ کہانی سنتا ہے، وہ یہ کہتا ہے۔ جب آدم اور حوا نے ایک مرتبہ ابلیس کی بات مانی تو پھر انہیں ہمیشہ ہی اس کی بات ماننی پڑتی تھی۔ ابلیس نے اُن کے بچوں کو بھی آزمائش میں ڈالا اور وہ بھی پھر ہمیشہ اس ہی کی بات مانتے رہے۔ اب اور سنو۔ یہ کتنی افسوسناک بات تھی کہ آدم اور حوا کے جو دو بیٹے تھے قائن اور ہابل، تو قائن نے پھر ابلیس کی بات مانی اور اپنے چھوٹے بھائی ہابل کو قتل کر دیا۔ جب خدا نے زمین پہ یہ گناہ ہوتے دیکھے تو اُسے بہت ہی رنج ہوا کہ ابلیس کتنا زور پکڑتا جا رہا ہے۔ اور انسانوں کو اپنے قابو میں کرتا چلا جا رہا ہے۔ تب اُس نے ایک ترکیب سوچی کہ وہ کس طرح انہیں شیطان کی طاقت سے چھڑائے تاکہ وہ ایک مرتبہ پھر خوشی کی زندگی بسر کر سکیں۔"

"کئی ہزار سال کے بعد خدا نے اس دنیا میں اپنا بیٹا بھیجا جس سے وہ بے حد محبت رکھتا تھا اُس نے اپنے بیٹے کو اس دنیا میں بھیجا کہ وہ انسانوں

کے بیچ میں زندگی گذارے۔ جب وُہ تیس برس کا ہو گیا۔ تو وہ فلسطین کے ملک میں اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔ اور لوگوں کو خُدا اور آسمان کے بارے میں تعلیم دیتا تھا۔ اُس نے بیماروں کو اچّھا کیا۔ لوگوں کے سامنے بہت سے معجزے بھی کئے، لیکن یہودی قوم کے بزرگ اُس سے جلنے لگے۔ آخر، جیسے میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا، انہوں نے اُسے پکڑ لیا اور صلیب پر لٹکا کر مار بھی ڈالا۔ لوگ اس کا مذاق اڑا رہے تھے اور ہنس ہنس کر اُسے طعنے دے رہے تھے۔ درد کی شدید لہریں اُس کے جسم میں دوڑ رہی تھیں، لیکن میرے خیال میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خُدا نے بھی اُسے اکیلا چھوڑ دیا ہو کیونکہ وُہ اُس وقت سب آدمیوں کے گناہوں کے بدلے میں اپنی جان دے رہا تھا۔ اُس نے پہلے کبھی بھی ایسے محسوس نہیں کیا تھا کہ خُدا نے اُسے چھوڑ دیا ہو۔ یہ اُس کی برداشت سے باہر تھا اس لیے وُہ چلّا اُٹھا "اَے میرے خُدا.... اَے میرے خُدا.. .. تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا!" کئی گھنٹوں تک تکلیف اُٹھانے کے بعد وہ مر گیا۔ لیکن تیسرے روز وُہ پھر مُردوں میں سے جی اُٹھا۔ اب رحمت، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہے۔ اور اس انتظار میں ہے کہ تم اس کے پاس آؤ اور اس پر ایمان لاؤ۔"

رحمت بڑی خاموشی سے یہ سب کچھ سُن رہا تھا اس نے ایک بار بھی بابا کی بات نہ کاٹی۔ لیکن اب وہ جلدی سے بول اٹھا۔ "بابا لال آپ کے لیے تو یہ سب باتیں بڑی آسان معلوم ہوتی ہیں لیکن مجھے یہ بتائیں کہ میں سچا مسیحی کس طرح بن سکتا ہوں"؟

"بیٹے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو اور اقرار کرو کہ اَے خُدا دند یسُوع میں اقرار کرتا ہوں کہ میں گنہگار ہوں"۔ بابا لال

نے رحمت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بیٹے، تمہارا خیال ہے، کیا تم اس بات کو مان لیتے ہو کہ تم گنہگار ہو؟ کیا تم مانتے ہو کہ گندے خیالات، بُری باتیں، جھوٹ، خود غرضی اور اس قسم کی دوسری بہت سی باتیں خُدا کی نظر میں گناہ ہیں؟"

رحمت نے سر ہلا کر کہا: "جی بابا جی۔ جب آپ نے ابھی مجھے آدم اور حوا کی نافرمانی کے بارے میں بتایا ہے تو میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ سب باتیں گناہ ہیں۔"

"بیٹے۔ اب تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسی حالت میں تم کبھی بھی آسمان میں نہیں جا سکو گے۔"

"جی بابا جی۔ یہی فکر تو مجھے بڑی مدت سے کھائے جا رہی ہے اور اسی وجہ سے میں خُدا کے پاس آنے سے ڈرتا تھا۔ اُس وقت تو میں اندازے سے ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ میں آسمان میں نہیں جا سکوں گا لیکن اب تو مجھے صاف صاف معلوم ہو گیا ہے۔"

"بیٹے اگر تم اچھی طرح یہ سمجھ گئے ہو تو مُبارک ہو۔ اچھا پھر اب آگے چلیں۔ چونکہ خُدا تم سے محبت رکھتا ہے اور اس نے اپنے بیٹے کو دُنیا میں اس لیے بھیجا کہ وہ تمہیں گناہ سے رہائی بخشے، اس لیے آؤ ہم پڑھیں کہ پاک کلام میں یوحنا کے تیسرے باب کی سولھویں آیت میں کیا لکھا ہے۔ "خُدا نے دُنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے۔"

رحمت نے بھی اپنا نیا عہد نامہ کھولا۔ "کیا یہ آیت میری کتاب میں بھی ہے؟"

"ضرور بیٹے۔ ذرا مجھے دو۔ میں تمہیں یہ حوالہ نکال کر دیتا ہوں۔ اُے... یہ رہا... دیکھو اس پر میں نے نشان بھی لگایا ہُوا ہے۔"

اب وارڈ میں بہت سے لوگ آ چکے تھے۔ بابا تو چاہتا تھا کہ رحمت کو اور بھی کلام کی باتیں بتائے لیکن رحمت کے ماں باپ اور بھائی بہن آ گئے۔

ماں نے اُسے بیٹھے دیکھ کر دُور ہی سے کہا: "میرے بیٹے، آج تو تم بہت خوش نظر آ رہے ہو!"

رحمت نے بابا جی کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "امّی، ان کا نام بابا لال ہے۔ وہ میرے پاس آتے ہیں۔ اور مجھے اچھی اچھی باتیں سکھاتے ہیں۔"

"اچھا بیٹے، اب تم اپنے ماں باپ سے ملو۔ میں چلتا ہوں۔ جب تم اکیلے ہو تو ان سب باتوں پر دوبارہ سوچنا، جن کے بارے میں ہم نے گفتگو کی ہے میں کل آنے کی کوشش کروں گا۔"

"سلام بابا جی، کل ضرور آئیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

اب رحمت کے چاروں طرف اس کے بھائی بہنیں اور ماں باپ کھڑے تھے۔ رحمت کو ایسے لگا جیسے وہ دھم سے آسمان سے زمین پر آ گرا ہو۔

جب بابا لال جا رہے تھے تو اُس کے دل پر رحمت کے لیے ایک بڑا بوجھ تھا۔ انہیں افسوس تھا کہ رحمت کے ماں باپ کے آجانے سے وہ اور بات چیت نہ کر سکے۔ لیکن وہ اپنے دل میں دُعا کرتے رہے کہ خدا اس بچے کے دل و دماغ کو چھوئے تاکہ وہ خدا کو اور اُس کے کلام کو دل سے قبول کر سکے۔

وارڈ سے سب رشتہ دار اور ملنے والے چلے گئے۔ اب رحمت اکیلا تھا۔ اس نے نیا عہد نامہ نکالا اور وہی آیت نکال کر بار بار پڑھی۔ وہ اس کہانی کے متعلق بھی سوچتا رہا جو آدم اور حوا کے بارے میں بابا جی نے اُسے سُنائی تھی۔ اس خیال نے اس کے دل کو گرمایا کہ خدا باپ کی طرح اُن کی فکر کرتا تھا۔ لیکن اس سے بڑھ کر اس کے دل پر اس بات کا اثر ہوا کہ خدا نے اپنے اکلوتے

بیٹے کو اِس دُنیا میں بھیجا کہ وُہ انسانوں کو شیطان کی غلامی سے چھڑائے۔

"خُداوند یسُوعؔ لوگوں کا سچّا دوست تھا" لڑکے نے سوچا۔ "کاش وُہ میرا بھی دوست بن جائے۔ لیکن شاید وُہ میرا دوست بننے سے انکار کرے۔" یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وُہ میٹھی نیند سو گیا۔

آٹھواں باب

رحمت نیند سے بیدار ہوا تو اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ جب بڑے ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھتے ہوئے اس کے پلنگ پر آئے، تو ہنسنے لگے۔ "رحمت خان بہادر..... آج تو تم بہت خوش دکھائی دے رہے ہو"۔ چارٹ دیکھ کر کہا: "اب تو بخار بھی نہیں ہے۔ اچھا دو دن کے بعد تم گھر جا سکتے ہو۔ خوش ہو نا!..... اب اس طرح کرو، تھوڑا تھوڑا چلنا شروع کر دو تاکہ ٹانگوں میں جان آجائے۔"

رحمت نیچی نظریں کئے مسکرا رہا تھا۔ اس نے بات تو کوئی نہ کی لیکن بڑا ہی خوش تھا: "واہ وا اب وہ گھر جائے گا"!!! وہ چاہتا تھا کہ کود کر اٹھ کھڑا ہو اور بھاگنا شروع کر دے۔ تاکہ ایک دم اس کی ٹانگیں مضبوط ہو جائیں۔

ڈاکٹر کے باہر جاتے ہی اس نے جھٹ چادر ایک طرف پھینکی اور تیزی سے روشندان کی طرف جانے لگا۔ ابھی دو قدم ہی لیے کہ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ جھٹ نزدیک والے پلنگ کا سہارا لیا۔

ذرا دیر آرام کر کے آگے بڑھا۔ اب اُس نے وارڈ میں ہی ایک چکر لگایا، اور آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ شام کو جب اس کا والد آیا تو وہ اُس کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا۔ آج اُس کے لیے کتنی خوشی کا دن تھا۔

لیکن وُہ قدرے مایوس بھی تھا۔ بابا جی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ اُس کی آنکھیں باہر والے پھاٹک پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ جتنی دیر وہ باہر رہا اُس طرف دیکھتا رہا۔ لیکن بابا جی کا نام و نشان نہ تھا۔ اندر آکر بھی انتظار ہی کرتا رہا۔ لیکن گھنٹی بجنے کے بعد تو وہ نہایت مایوس ہو گیا۔ اُسے بے حد افسوس تھا کہ آج بابا نہیں آئے تھے۔

"ہائے کیا ہوگا! اگر بابا جی کل بھی نہ آئے اور میں گھر چلا گیا تو پھر میں اُنہیں کہاں ڈھونڈوں گا! مجھے تو اُن کے گھر کا بھی پتہ نہیں ہے۔ سچا مسیحی بننے میں اب کون میری مدد کرے گا!" وُہ خُدا سے ڈرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اُس کو اُس کے مہربان ہونے کے متعلق اب تک تسلی نہ تھی۔ دُوسری صبح بھی آہستہ آہستہ گذر رہی تھی۔ رحمت نے اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے میں اپنے آپ کو مصروف رکھا لیکن دل میں وُہ بہت ہی بے چین تھا۔ اچانک اس کے دل سے یہی الفاظ نکلے "۔ خُداوند ..... مہربانی سے بابا جی کو میرے پاس بھیج دے۔" بار بار اُسے یہی خیال آتا کہ آج کا دن اُس کا ہسپتال میں آخری دن ہے۔ اسی کش مکش میں وُہ اپنے پلنگ پر آبیٹھا۔

نہ جانے کیوں ایک زبردست خواہش اُس کے دل میں آئی کہ وُہ خُدا سے دُعا کریگا اُسے بابا کی باتیں یاد آئیں۔ بابا جی نے کہا تھا کہ خُدا دُعا کو سُنتا اور ضرور جواب دیتا ہے "۔ میں اب دیکھوں گا کہ میری دُعا سُنی جاتی اور قبول

ہوتی ہے یا نہیں اور بابا جی آج شام میرے پاس آتے ہیں یا نہیں ؟"

وُہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہُوا اور باہر کا تماشا دیکھنے لگا۔ کوئی مریض ٹیکسی میں آرہا تھا کوئی جا رہا تھا۔ رکشا بھاگے چلے جا رہے تھے۔ دور آسمان میں ایک جہاز اڑ رہا تھا۔ کوئی ہسپتال کے اندر آ رہا تھا کوئی باہر جا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا آگیا۔ رحمت نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اپنے پلنگ پر لیٹ کر سو گیا۔

اُس کے لیے کتنے اچھنبے کی بات تھی۔ چار بجنے ہی والے تھے کہ بابا جی رحمت کو کندھے سے ہلا کر اُٹھا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے رحمت نے آنکھیں کھولیں۔ اُس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے بابا جی کے ہاتھ تھام لیے۔ بابا نے اُسے کھینچ کر بٹھاتے ہوئے کہا "آج تو بڑی گہری نیند سو رہے تھے بیٹے رحمت۔"

"ہاں بابا جی۔ لیکن بابا جی، کل مَیں آپ کا بہت انتظار کرتا رہا۔ آپ آئے ہی نہیں۔ اُس نے اپنے بالوں کو ہاتھ سے درست کیا اور کہا "مجھے یہ ڈر تھا کہ اب شاید میں آپ سے مل ہی نہ سکوں گا۔ کیونکہ کل بابا جی مَیں گھر جا رہا ہُوں"۔

رحمت پلنگ سے نیچے اُترا اور اپنی چپل پہن کر کہا "آئیں باہر چل کر چمن میں بیٹھتے ہیں۔ وہاں بات چیت ہوگی۔"

بابا جی حیران ہو کر رحمت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ "مُبارک ہو بیٹے تم اب چل پھر سکتے ہو۔ خُدا وند کا شکر ہو۔"

دونوں باہر برآمدے میں آگئے۔ "بیٹے کل میں نہ آسکا۔ باغ میں نئے پودے لگانے تھے۔ میں اندھیرا ہونے تک وہاں ہی کام کرتا رہا۔ اِس لیے

نہ آسکا۔ لیکن آج تو بہت جلدی آگیا ہوں۔"

برآمدہ بالکل بھرا ہوا تھا۔ دونوں راستہ بناتے آگے بڑھتے گئے اور پھر دروازہ سے نکل کر باہر آگئے۔

"بابا جی، جب میں پہلے دن یہاں آیا تو میرا یہاں دل نہیں لگ رہا تھا اور پھر دواؤں کی خوشبو سے تو مجھ سے سانس بھی نہیں لی جاتی تھی۔ پہلے دن تو مجھے یہاں بڑا ڈر لگا لیکن اب تو یہ بالکل گھر کا سا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔ پہلے دن کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" باہر چمن میں وہ ایک جھاڑی کے قریب جا بیٹھے۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

رحمت بڑا بے چین اور وہ جلد از جلد بائبل کی باتیں سننے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے یوں کہا۔ "بابا جی، پرسوں جو کچھ آپ نے مجھے بتایا تھا میں اس پر بڑا غور کرتا رہا ہوں۔ ایک چیز جس کی مجھے سمجھ نہیں آتی وہ یہ ہے کہ خدا کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ انسان کی اتنی فکر کرتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا کہہ سکتا تھا۔ اے انسانو! تم نے میری بات نہ مانی۔ اب جاؤ اور ابلیس کی غلامی کرو۔ جاؤ، دیکھو وہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے لیکن اس نے یہ تو کیا نہیں بلکہ الٹا ایک اور طریقہ سوچا کہ کس طرح بدکار اور گنہگار انسان کو بچائے۔"

"ہاں بیٹے، خدا ہمیں بے حد پیار کرتا ہے اور جب تک اس نے دوبارہ انسان کے لیے آسمان پر جانے کا راستہ نہ بنا دیا اسے چین نہ آیا۔ ہمارے بچائے جانے کے لیے خدا کو ایک بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اس نے ہم سب کے گناہ اور برے کام اپنے بیٹے پر لاد دیئے۔"

بابا نے تھیلے میں سے بائبل نکال کر صفحے پلٹے اور کہا "اچھا اب سنو۔ یسعیاہ کے ترپنویں باب کی پانچویں آیت میں کیا لکھا ہے۔ وہ (یعنی خداوند یسوع مسیح)

ہماری خطاؤں کے سبب سے گھائل کیا گیا.... ہماری ہی سلامتی کے لیے اُس پر سیاست (یعنی سزا) ہوئی تاکہ اُس کے مار کھانے سے ہم شفا پائیں۔"

رحمت نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "باباجی، یہ میری سمجھ سے بالکل باہر ہے۔ ایک طرف تو خدا نے آدم اور حوا کو نافرمانی کی اس قدر سخت سزا دی کہ انہیں اپنی حضوری سے نکال دیا اور دوسری طرف وہ اتنا مہربان نظر آتا ہے کہ ایک مقدس شخص کی موت سے وہ سب چیزوں کو بحال کر دیتا ہے۔ ایک طرف تو خدا بہت سخت نظر آتا ہے اور دوسری طرف بہت رحم دل۔"

"ہاں بیٹے، بھید کی یہی بات ہے اور یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ لیکن رومیوں کے خط کے پانچویں باب کی اٹھارویں آیت میں بالکل ایسی ہی بات لکھی ہے۔ جیسی تم نے ابھی کہی ہے۔ "جیسے ایک گناہ کے سبب سے وہ فیصلہ ہوا جس کا نتیجہ سب آدمیوں کو سزا کا حکم تھا۔ ویسے ہی راستبازی کے ایک کام کے وسیلے سے سب آدمیوں کو وہ نعمت ملی جس سے راستباز ٹھہر کر زندگی پائیں۔"

باباجی، یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن خدا کو خوش کرنے اور آسمان میں جانے کے لیے کیا کرنا چاہیئے! آپ نے بتایا تھا کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ خداوند مسیح نے کھول دیا ہے۔ اب کیا میرے لیے یہ کافی ہے کہ میں اچھے کام کروں، اچھی زندگی گزاروں۔ گرجے جاؤں اور کبھی کبھی روزہ بھی رکھ لوں؟"

بابا نے زور سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "بالکل نہیں۔ ایسے کاموں سے ہم کبھی بھی اپنے لیے آسمان میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ ابدی زندگی تو خدا ہمیں انعام میں دیتا ہے۔ سنو رومیوں پانچ باب کی تیئس آیت میں کیا لکھا ہے۔ "گناہ کی مزدوری موت ہے۔ مگر خدا کی بخشش.... ہمیشہ کی زندگی ہے، یہ سمجھنا

بہت آسان ہے نا! اگر تمہیں کہیں سے کوئی بخشیش یا تحفہ ملتا ہے تو سب سے پہلے تم کیا کرتے ہو؟"

رحمت نے ایک دم جواب دیا "میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" بابا نے سمجھاتے ہوئے کہا "لیکن اُس سے بھی پہلے تم یہ کرتے ہو کہ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہو اور اس انعام کو اپنے ہاتھ میں تھامتے ہو۔ بالکل اسی طرح ہمیں خدا کے تحفے کے ساتھ بھی کرنا ہے۔"

رحمت نے بڑی بیتابی سے کہا "لیکن مجھے یہ تحفہ کہاں سے ملے گا؟"

"بیٹے یہ تحفہ جو خدا نے ہمیں دیا ہے۔ یہ اُس کا بیٹا یسوع مسیح ہی تو ہے۔ اور اُس کو تم نے اپنی زندگی میں قبول کرنا ہے۔ یوحنا کے پہلے باب کی بارہویں آیت میں کتنی پیاری آیت ہے۔" جتنوں نے اُسے قبول کیا، یعنی اُس کے نام پر ایمان لائے اُس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا۔"

"تو بس بابا جی، ہمیں صرف اتنا ہی کرنا ہے!"

"ہاں بیٹے، خدا نے یہ بات اتنی آسان بنائی ہے کہ بچے بھی خدا کے فرزند بن سکتے ہیں۔"

"تو بابا جی۔ میں بھی خدا کا فرزند بننا چاہتا ہوں۔ اب مجھے جلدی سے بتائیں کہ میں کیا کروں! جو کچھ آپ نے مجھے بتایا ہے۔ میں اُسے مانتا ہوں۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میں گنہگار ہوں۔ اور اب میرا یہ ایمان بھی ہے کہ خداوند مسیح میرے گناہوں کے لیے مُوا۔ اب بتائیں، اب میں کیا کروں!"

"تو بیٹا یہ سب باتیں خداوند یسوع مسیح کو بتا دو، کیونکہ وہ اس جگہ موجود ہے اور تمہاری ساری باتیں سُن رہا ہے۔ اُس سے بات کرو بالکل ایسے جیسے تم اپنے کسی دوست سے بات چیت کر رہے ہو اُسے کہو کہ تمہیں

افسوس ہے کہ تم نے گناہ کئے ہیں۔ تم ان کی معافی مانگو۔ تم تو خود جانتے ہو کہ تم میں کون کون سے گناہ ہیں۔ شاید جھوٹ، غصہ، گندے خیال یا اس قسم کی اور باتیں۔ اُسے بتاؤ کہ تمہیں افسوس ہے کہ تم نے ان باتوں سے اُسے کتنا رنجیدہ کیا ہے۔ پھر اُس کا شکریہ ادا کرو کہ تمہارے بدلے صلیب پر مُوا اور اُس سے درخواست کرو کہ وہ تمہاری زندگی میں داخل ہو۔"

پھر بابا لال نے اپنا سر جُھکا لیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ رحمت نے بھی ویسا ہی کیا۔ پہلے تو اُس سے دُعا کی ہی نہیں گئی۔ اُس کی زبان جیسے بند ہو گئی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ رُکتے رُکتے اس نے کہنا شروع کیا: "میرے پیارے خُداوند یسوع، مجھے بہت افسوس ہے کہ اس سے پہلے میں نے کبھی تیری بابت کچھ خیال نہ کیا۔ اب تک میں اپنی مرضی ہی کرتا رہا ہوں۔ جب دل کرتا تھا تو جھوٹ بول دیتا۔ جب جی کرتا تو چیزیں چُرا لیتا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ سب غلط تھا۔ مجھے معاف کر دے! اکثر میری بہنوں کے ساتھ میرا سلوک بہت ہی خراب اور کمینہ تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ کہ وُہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو سب غلط اور بُری ہیں۔ خُداوند یسوع، میرے دل میں آ، اور میری زندگی کو بدل دے تاکہ میں تیرے ساتھ ایک نئی زندگی گذار سکوں۔ یہ بھی بخش کہ میں تیرے کلام کو پڑھ بھی سکوں اور اُسے سمجھ بھی سکوں۔۔ آمین۔"

رحمت جیسے لڑکے کے لیے یہ ایک لمبی اور دل سے مانگی ہوئی دُعا تھی۔ لیکن اس کے بعد اُسے ایک عجیب قسم کی خوشی محسوس ہونے لگی، کیونکہ اس کا ایمان تھا کہ خُدا نے اُس کی دُعا سُن لی ہے اور اُسے اپنے فرزند بننے کے لیے قبول کر لیا ہے۔

بابا لال مسکرائے "اب میرے بیٹے تمہیں خدا سے کبھی بھی ڈرنا نہیں چاہیئے۔ تم اُس سے جب بھی چاہو، دن ہو یا رات، کسی بھی گھڑی بات چیت کر سکتے ہو۔ وہ ہمیشہ تمہارے انتظار میں ہوگا۔ اپنے تمام دکھ درد اُسے بتایا کرو۔ وہ تمہاری رہنمائی اور تمہاری مدد کرے گا۔ یہ کبھی نہ بھولو کہ جتنی دفعہ بھی ممکن ہو اُس سے دُعا کرو۔"

اب بابا لال نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور پنسل سے اُس پر کچھ لکھ کر رحمت کو دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹا، یہ میرے گھر کا پتہ ہے۔ تم جب ہسپتال سے فارغ ہو کر چلے جاؤ تو جب بھی تمہارا جی چاہے میرے پاس ضرور آیا کرنا۔ میں نیا عہد نامہ پڑھنے میں بھی تمہاری مدد کروں گا۔ تمہارے ذہن میں اگر کوئی سوال ہو تو میں اس کا بھی جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"

رحمت نے پتہ اپنی جیب میں ڈالا۔ "ضرور بابا جی، میں ضرور آپ سے ملتا رہوں گا۔ شاید میں گلبرگ چوک میں دوبارہ وہی کام کروں لیکن وقت نکال کر میں ضرور آپ کے پاس آیا کروں گا۔"

"بہت اچھا بیٹے۔ دوپہر یا شام کو جس وقت بھی چاہو تم میرے پاس آؤ۔" بابا جی نے بائبل اپنے تھیلے میں ڈالی۔ اور رحمت کے سر پہ ہاتھ رکھ کر دُعا دی اور رُخصت ہوا۔

جاتے جاتے رحمت نے پھر کہا۔ "بابا جی، میں ضرور آیا کروں گا۔"

"ضرور بیٹے اور اب اپنے منجی خداوند مسیح سے کبھی دُور نہ ہونا۔"

رحمت وہیں کھڑے کھڑے بابا کو دُور تک جاتے دیکھتا رہا۔

بابا لال اپنے دل میں بہت خوش تھے کہ وہ ایک لڑکے کو آسمان پر

جانے کا راستہ دکھا سکے ہیں۔

رحمت اپنی جگہ خوش تھا۔ کیونکہ اب وہ ایسے محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اُس کے اُوپر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

وارڈ میں اپنے پلنگ کی طرف جاتے جاتے وہ دِل میں سوچ رہا تھا۔

"اب میں اپنے ماں باپ اور بہنوں کو یہ ساری باتیں بتاؤں گا تاکہ انہیں بھی حقیقی مسیحی ہونے کی خُوشی حاصل ہو جائے۔"

نواں باب

آخر وہ دِن آ پہنچا کہ رحمت کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ جب اُس کا باپ اُسے لینے کے لیے آیا تو وُہ بڑا خُوش نظر آ رہا تھا۔ "ابّا جی! اچھا کیا جو صُبح ہی صُبح مجھے لینے کے لیے آپ آ گئے ہیں!"

"ہاں بیٹے، میں جلدی اس لیے آیا ہُوں کہ اب تمہارے پلنگ کی کسی اور کو ضرورت ہوگی۔ ورنہ پہلے میں کام پر جاتا اور دوپہر کے بعد تمہیں لینے آتا۔" ابّا نے رحمت کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ بھئی وا۔ رحمت تمہارا قد تو میرے برابر ہو گیا ہے۔ دیکھو تم بالکل میرے کندھے تک آ پہنچے ہو۔"

"ہاں ابّا جی، میں آپ سے بھی قد میں اونچا ہو جاؤں گا۔"

باپ ہنسا۔ "اچھا جی....."

"ابّا، آپ سائیکل پر آئے ہیں؟"

"ارے پگلے نہیں۔ آج ہم اپنے بیٹے کو رکشا پر گھر لے جائیں گے۔"

رحمت نے جلدی جلدی اپنی چیزیں سنبھالیں اور گٹھڑی بنا کر پلنگ پر

رکھ دی۔

"رحمت، ڈولی میں بھی دیکھ لو۔ کچھ رہ نہ جائے۔"

"نہیں ابّا جی، میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ بس میری یہی چیزیں ہیں۔"

"اچھا آپ یہ اُٹھالیں۔ میں ذرا اپنے ساتھیوں کو مل لوں۔" رحمت ڈرتا ہُوا وارڈ کے آخر تک گیا اور سب سے ہاتھ ملاتا ہُوا آگے بڑھتا گیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جو مریض زیادہ بیمار تھے، وہ تو اُس کے جانے پر رشک کر رہے تھے۔ لیکن دوسرے خوش ہو ہو کر اُسے مُبارکباد کہہ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ بڑھتا ہُوا وہ پھر اپنے باپ کے پاس آگیا اور کہا۔ "چلئے ابّا جی، اب چلیں۔"

دروازے پر انہیں وارڈ کی سسٹر مل گئی۔ وہ بولی۔ "رحمت مُبارک ہو..... گھر جا رہے ہو۔ تب ہی تو اتنے خوش ہو۔" پھر رحمت کے باپ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ نے سارے کاغذات لے لیے ہیں۔ اور دفتر میں بل ادا کر دیا ہے؟ ذرا رسید تو دکھائیں۔"

باپ نے اپنی قمیض کی جیب سے چند کاغذات نکالے اور رسید سسٹر کو دیتے ہُوئے کہا۔ "میں نے سارے پیسے ادا کر دیئے ہیں۔"

سسٹر نے عینک لگا کر غور سے رسید دیکھی اور واپس دیتے ہوئے کہا۔ "سب ٹھیک ہے۔ اچھا جی خدا حافظ۔" اور وہ انہیں ہسپتال کے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

اب دونوں باپ بیٹا باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ رحمت ہسپتال کی باتیں بتا رہا تھا۔ اور باپ گلی محلے اور گھر کی باتیں سُنا رہا تھا۔ اب وہ ہسپتال کے باہر والے دروازے تک جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے ایک

رکشا لیا۔ رحمت اُس پر پہلے سوار ہُوا پھر باپ بھی بیٹھ گیا اور رکشا والے کو شاہ جمال چلنے کو کہا۔

رکشا سٹارٹ ہُوا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ رحمت نے خوشی میں اپنے باپ سے کہا: "تو ابا جی ہم اب گھر جا رہے ہیں"۔ راستہ اُس کا جانا پہچانا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ نہر کے پُل پر سے گزرے۔ یہ وہی پُل تھا۔ جس پر سے وہ اپنے باپ کے ساتھ سینکڑوں مرتبہ گزرا تھا۔

باپ نے بھی بیٹے کی خوشی کا اندازہ لگا لیا تھا، بولا "بس اب ہم گھر پہنچ چکے ہیں۔ وہ رہا ہمارا محلّہ"۔ اور رکشا والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس سے رُکنے کے لیے کہا: "جب رکشا ٹھہر گیا تو اس نے میٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ہیں ہیں ذرا سے فاصلے کے لیے اتنے پیسے؟ کیا بات ہے بھئی۔ تمہارا میٹر تو بہت تیز چلتا ہے"۔

رکشا والے نے قدرے غصّے سے کہا: "یہ تو آپ غلط کہتے ہیں۔ مَیں نے تو کبھی ایک ٹیڈی پیسہ بھی کہیں سے زیادہ نہیں لیا۔ جو میٹر پہ بنا ہے بس وہی دے دو"۔

باپ نے جیب میں ہاتھ مارتے ہوئے کہا: "بھئی کچھ غریبوں کا خیال کیا کرو۔ یہ بچّہ تین ہفتے سے ہسپتال میں داخل تھا اب تم خود ہی خیال کرو کہ میرا کتنا پیسہ وہاں خرچ ہُوا ہوگا"۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید رکشا والا کچھ رعایت کر دے گا۔ لیکن رکشا والے نے بڑے رُوکھے پن سے کہا۔ "بابو جی، ہمیں بھی تو کوئی آٹا مفت نہیں دیتا۔ کمائیں گے تو کھائیں گے"۔

تب رحمت کے باپ نے زور سے سانس لیتے ہوئے رکشا والے کو پیسے دیئے۔ پیسے لے کر رکشا والے نے اپنا رکشا چلایا اور گرد کا بادل چھوڑتا

ہوا تیزی سے اُن کے پاس سے گذر گیا۔

رحمت کا باپ ہنسا "یہ رکشا والے بھی کتنے سخت دل ہوتے ہیں۔ ذرا لحاظ نہیں کرتے۔ خیر ہم نے کون سا روز روز رکشا پر بیٹھنا ہے۔ ہماری سائیکل زندہ باد"

اب وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے۔ ایک سبزی والے نے بڑا سا ٹوکرا سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اُس نے آواز دی "آلو، ٹماٹر، بینگن، پیاز، لہسن، ہری مرچیں، ساگ، سبزی والا ..... شملہ کی مرچیں، سبزی والا"

ایک گھر میں سے چھوٹی سی لڑکی نے دروازے کا پردہ اُٹھایا۔ اور پکارا۔ "سبزی والے .... میری امّی بلاتی ہیں"

سبزی والے نے اپنا ٹوکرا ان کے دروازے پر اُتارا۔ گیلا ٹاٹ کا ٹکڑا ہٹایا۔ اور زمین پر بیٹھ گیا۔ بچّے کی امّی بھی زمین پر بیٹھ کر سبزیاں دیکھنے لگی اور پالک چن کر نکالی اور اُسے تولنے کو کہا۔

"کیوں رحمت ہے نا، سب کچھ ویسے ہی! جیسے تمہارے بیمار ہونے سے پہلے تھا! سبزی والا گلی محلّے میں سبزی بیچ رہا ہے"

رحمت نے ہنس کر کہا "جی ابّا جی۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں"

اب دونوں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ باپ نے آگے بڑھ کر کنڈی کھٹکھٹائی اور زور سے کہا "کوئی ہے؟"

جلدی جلدی سب رحمت کو خوش آمدید کہنے دوڑے "بھیا آگئے ... بھیا آگئے" بچّے کورس گانے لگے اور چھوٹا فلپ بھی ہنس ہنس کر تالی بجانے لگا۔ دونوں بہنیں اُس سے لپٹ گئیں۔

"ارے ارے کیوں مجھے دبا کر مارنے لگے ہو۔ ذرا الگ تو ہو۔ میں کہیں بھاگ کر تھوڑا جا رہا ہوں" رحمت نے بڑے پیار سے دونوں

بہنوں کے ہاتھ چھڑائے اور صحن میں داخل ہُوا۔

ماں نے رحمت کو پیار کرتے ہوئے کہا: "بیٹا تمہارے گھر آنے کی ہمیں کتنی خوشی ہے! چارپائی پر بیٹھ جاؤ میرے لعل۔ کیا ابھی بھی کمزوری محسوس ہوتی ہے؟"

چارپائی پر لیٹتے ہوئے رحمت نے جواب دیا: "جی، تھوڑی تھوڑی۔ لیکن میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

ماں نے جلدی سے چولہے پر پانی رکھا تاکہ ان کے لیے چائے بنائے۔

بشیرہ نے ننھے کو گود میں اُٹھایا ہُوا تھا۔ آستر دوسری طرف کھڑی تھی۔ دونوں بڑے غور سے رحمت کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ بشیرہ نے ہنستے ہُوئے کہا: "بھائی جی، آپ بڑے دُبلے نظر آرہے ہیں۔ کیا ہسپتال والے آپ کو کچھ بھی کھانے کو نہیں دیتے تھے؟"

آستر نے اپنا دوپٹہ انگلی کے گرد لپیٹتے ہُوئے کہا: "اب تو آپ بالکل ٹھیک ہیں نا بھائی جان!"

"بالکل، بالکل" رحمت نے جمائی لیتے ہُوئے کہا: "اب میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہُوں۔ کل سے میں پھر کام پر جاؤں گا۔ ابّا نے مجھے بتایا ہے کہ انہیں میری بیماری پر کتنا پیسہ خرچ کرنا پڑا ہے۔"

ماں چائے کے گرم گرم دو پیالے لے آئی۔ ایک پیالہ جس میں دُودھ بہت زیادہ تھا، رحمت کو دیا اور کہا: "لو میرے بیٹے چائے پی لو۔" دُوسرا پیالہ اُس نے رحمت کے ابّا کو دیا۔ اور دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے کہا "یہ بالکل غلط ہے کہ آپ کل سے رحمت کو کام پر جانے دیں۔ وُہ آج ہی تو ہسپتال سے آیا ہے۔ دیکھیں کس قدر کمزور نظر آرہا ہے۔"

ابّا کو کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا جواب دے۔ واقعی اُنہیں علاج کے لیے ایک خاصی رقم دینی پڑی تھی۔ اور اب انہیں کافی تنگی تھی۔ اُس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ ذرا ٹھہرو تو.... دیکھا جائے گا۔"

لیکن بیوی نے اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو کوئی جواب نہ ہُوا، اور ہاں۔ اگر آپ یہ جانتے ہیں کہ اب کوئی پیسے کمائے، تو پھر میں کام پر جاؤں گی۔ رحمت ابھی بہت کمزور ہے۔ وہ ابھی گھر پر ہی آرام کرے۔ خان صاحب کی نوکرانی کل ہی چھ دن کی چھٹی پر گھر گئی ہے۔ میں چھ دن اُن کے ہاں کر دوں گی۔ کیا خیال ہے آپ کا"؟ رحمت کے ابّا نے سر ہلایا۔ "جیسے آپ کی مرضی۔"

رحمت کا ابّا دِل میں سوچ رہا تھا۔ "کاش رحمت کو بھی کہیں نوکری مل جائے۔ اُس نے خاصا لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ اب اُسے کہیں نوکری پر کھڑا کرنا چاہیئے۔ پہلے تو ٹھیک تھا کہ وہ مارکیٹ میں رہ کر کچھ نہ کچھ کما لیتا تھا۔ لیکن اب وہ بارہ برس کا ہو گیا ہے اور اس کے لیے مارکیٹ میں آوارہ گھومنا ٹھیک نہیں۔"

کچھ اس قسم کے خیالات ماں کے ذہن میں بھی تھے۔ اُس نے کہا "کیوں نہ میں خان صاحب سے کہوں کہ وہ رحمت کو اپنے گھر میں ہی کام پر لگائیں۔ چمن کی دیکھ بھال اور بنگلے میں اندر جھاڑ پونچھ کے لیے انہیں ایک آدمی کی ضرورت بھی ہے۔ لیکن ڈر ہے تو بیگم صاحبہ کا۔ وہ بڑی تیز مزاج ہے۔ نوکروں کا تو دم ہی خشک رہتا ہے اور تو اور اس کے سائے سے تو خان صاحب بھی بھاگتے ہیں۔"

رحمت نے کان پکڑے۔ "توبہ توبہ۔ امی جان، میں تو کبھی وہاں نہیں

جاؤں گا۔ اس سے تو اچھا ہے کہ میں مارکیٹ میں ہی کام کروں۔"

جب ابّا نے رحمت کی سہمی ہوئی شکل دیکھی تو بے اختیار ہنس پڑا اور کہا:" چلو چھوڑو ابھی اس معاملے کو۔ دیکھا جائے گا۔ ایک نہ ایک دن اُس کے لیے کوئی اچھی سی نوکری مل ہی جائے گی۔ تب تک وہ گھر ہی میں رہے اور آرام کرے۔ ابھی اُسے آرام کی ضرورت ہے۔"

"ابّا جی۔ آپ نے بہت اچھا فیصلہ دیا ہے۔ مَیں اُس ڈائن بیگم کے گھر بالکل نہیں جاؤں گا۔"

رحمت کو اچانک کمزوری محسوس ہوئی۔ اُس نے انگڑائی لی اور پلنگ پر پھر لیٹ گیا۔ بائیں کروٹ لیتے ہی اُسے اپنی جیب میں کچھ سخت سخت سا لگا۔ اُس نے ٹٹول کر دیکھا تو وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا اُسے ایک دم یاد آیا کہ اس کاغذ پر تو بابا لال نے اپنا پتہ لکھ کر اُسے دیا تھا۔ اُس نے ایک دم اپنے دِل میں فیصلہ کیا کہ وہ اپنے والدین کو بابا لال کی مُلاقات کے بارے میں بتائے گا۔" ابّا جی۔ مَیں پہلے بھی آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ میں مسیحی ہو گیا ہوں۔"

باپ کو جیسے کسی کیڑے نے کاٹ کھایا ہو۔ چیخ کر بولے" کیا کہا۔ تم مسیحی ہو گئے ہو!!! تو اب تک تم کیا تھے؟ کیا تم ایک مسیحی خاندان میں پیدا نہیں ہوئے ہو"؟

"یہ ٹھیک ہے ابّا جی۔ لیکن آپ اتنے گھبرا کیوں گئے ہیں۔ ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔" وُہ اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے گھٹنے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہنے لگا۔" یہ تو ٹھیک ہے کہ میرا مسیحی نام تھا۔ مَیں مسیحی گھر میں پیدا ہُوا تھا۔ لیکن مجھے نہ خُدا کے بارے میں کچھ علم

تھا، نہ کلام کے بارے میں۔"

"تو پھر" باپ نے بے صبری سے پوچھا!!

"ہاں ابا جی۔ جب میں بیمار تھا تو مجھے بس یہی ڈر تھا کہ میں بھی طارق کی طرح مر جاؤں گا۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو۔ لیکن ابا جی۔ مجھے خدا سے بھی بے حد ڈر لگتا تھا۔"

باپ نے ہنس کر اُس کے کندھے کو تھپتھپایا "ارے بیٹا۔ تم کن مذہبی بکھیڑوں میں پڑ گئے ہو۔ مجھے تو ان کی سمجھ نہیں ہے۔ ہاں مجھے یہ بتاؤ کہ یہ باتیں بتائی کس نے ہیں! کیا اُس بڈھے نے تو نہیں جو اکثر تمہارے پاس بیٹھا رہا کرتا تھا؟"

"جی ابا جی۔ وہ بابا لال تھے۔ وہ بڑی اچھی طرح بائبل کی باتیں بتایا کرتے تھے۔" پھر رحمت نے اپنے ابا کو جو کچھ وہ خدا کے بارے میں جانتا تھا بتایا اور آخر میں کہا "اب ابا جی۔ میں بھی اس نئی زندگی میں چلنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔"

اس کے ابا نے بڑی بے دلی سے کہا "جو تمہاری مرضی ہے کرو۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ بھلا کون اس قسم کی نیک زندگی گذار سکتا ہے"! یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور صحن سے باہر نکل گیا۔

رحمت نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اُسے اپنے باپ پر سخت افسوس ہوا۔ اُس نے سوچا کہ جب اُس کا باپ کچھ سننا نہیں چاہتا تو پھر اُسے کچھ اور بتانے سے فائدہ ہی کیا۔

اُس کی امی نے بھی یہ بات چیت سُنی تھی۔ جب اُس نے رحمت کی مایوسی دیکھی تو وہ اُس کی چارپائی پر آ بیٹھی اور سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے

ہوئے کہا۔ "بیٹے، جو کچھ بھی بابا لال نے تمہیں بتایا ہے وہ سب ٹھیک ہے۔ اب تم کوشش کرو کہ اچھے مسیحی بن جاؤ۔ بھلا اس میں نقصان کس کا ہے!"

رحمت نے اوپرے دل سے کہا۔ "ٹھیک ہے ماں جی۔" وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ تھک گیا ہو اور سونا چاہتا ہو۔ دراصل وہ اپنی امی کی بات پر اور بھی زیادہ رنجیدہ ہو گیا تھا۔ کہ وہ بھی خدا کے بارے میں کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اُسے بھلا اچھا بننے کی کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تو اس نے اپنا ایک نیا دوست بنا لیا تھا۔ جس سے وہ بہت ہی زیادہ محبت رکھتا تھا۔ کیونکہ اس دوست نے اُس کے لیے بہت کچھ کیا تھا رحمت اب ایک اس قسم کی زندگی گذارنا چاہتا تھا جو اُس کے اِس نئے دوست خداوند یسوعؔ کو پسند ہو۔ اور اب اُس کی خوشی اس میں تھی کہ وہ اپنے نئے دوست کے بارے میں اور بھی زیادہ جان سکے۔

لیٹے لیٹے اُس نے سوچا۔ "مجھے بابا لال کو ضرور ملنا چاہیئے اور یہ جتنا جلدی ہو اتنا ہی اچھا ہو گا۔ نئے عہد نامے کو پڑھنے اور سمجھنے میں وہ میری پوری پوری مدد کر سکتے ہیں۔"

اب رحمت کافی تھک چکا تھا۔ نیند سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں لیکن اُس کا دماغ بڑا بوجھل تھا، اس لیے وہ سو نہ سکا، اچانک اُسے یہ خیال آیا "کیوں نہ میں اپنے دوست خداوند یسوعؔ سے مدد لوں اور اُسے ساری بات بتا دوں۔"

وہ پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر رکھا اور اپنے دوست خداوند یسوعؔ سے کہنے لگا۔

"میرے پیارے دوست۔ اس گھر میں تجھے کوئی بھی جاننا نہیں چاہتا ہے۔ مہربانی سے میرے والدین اور بھائی بہنوں کو بھی بچالے تاکہ وہ بھی تجھے پیار کریں۔ پیارے خدا وند میری نوکری کا بندوبست کردے تاکہ مجھے کسی اچھی سی جگہ نوکری مل جائے۔ آمین۔" وہ دل میں خوش تھا کہ اس کا دوست اُس کے دُکھ کو سمجھتا ہے اب اس کے دل میں بڑی تسلی تھی۔ اُسے پوری اُمید تھی کہ خدا وند یسوع اُس کو نوکری دلائے گا۔ اور ہر بات ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر وہ گہری نیند سو گیا۔

دسواں باب

دوسرے دن رحمت کا گھر میں دل نہ لگتا تھا۔ والد تو اپنے کام پر چلا گیا اور ماں بھی خان صاحب کے گھر جا چکی تھی۔ چھوٹی بہنیں پہلے تو گھر میں کام کرتی رہیں، پھر فلپ کو اُٹھا کر باہر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے چلی گئیں۔

لیٹے لیٹے رحمت کا جی اُکتا گیا۔ ایک لمبی سی اباسی لیتے ہوئے اُس نے دل میں کہا: "خیر آج تو سہی لیکن کل تو میں ہرگز ہرگز گھر میں نہیں رہوں گا۔"

اچانک اُسے اپنی انجیل یاد آئی۔ وُہ جھٹ کمرے میں گیا اور الماری میں سے انجیل نکالی جو اُس نے ایک خوبصورت سے رومال میں لپیٹی ہوئی تھی۔ خوشی سے اُس کا دِل تیزی سے دھڑکنے لگا اور وہ سوچنے لگا۔

"کیا مَیں اسے پڑھ سکوں گا۔ اور سمجھ بھی سکوں گا؟" وہ باہر چارپائی پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور کتاب کو کھولا۔ سب سے پہلے حِصّے کا نام متّی کی انجیل تھا۔ رحمت نے لفظوں پر اُنگلی رکھی اور آہستہ آہستہ ہجے کر کر کے پڑھنے لگا۔ پہلے پہل تو بہت سے ایسے نام تھے جو نہ ہی وُہ پڑھ سکا،

نہ ہی صحیح طور پر اُنہیں بول ہی سکا۔ اُس نے ناموں والا حصّہ چھوڑ دیا۔ جب وُہ آگے بڑھا تو خوشی سے اس کا چہرہ چمک اُٹھا۔ کیونکہ اب وہ اپنے دوست کی پیدائش کی دلچسپ کہانی پڑھ رہا تھا۔

وُہ حیران ہُوا کہ خُداوند یسُوعؑ تو اُس سے بھی زیادہ غریب تھا کیونکہ جب وُہ پیدا ہُوا تو اُس کے لیے بستر بھی نہ تھا۔ رحمت پڑھتا چلا گیا اور وُہ ایک اور ہی دنیا میں تھا جو اُس کے لیے بالکل نئی تھی۔ بعض دفعہ اُسے ایسے لفظ چھوڑ دینے پڑتے جو اُس کی سمجھ میں نہ آتے۔ لیکن اُسے پُوری کہانی کی تو سمجھ آ ہی رہی تھی اور اُسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وُہ بیان اُس کو بچانے والے دوست خُداوند یسُوعؑ کے بارے میں ہے۔

جب باہر گرمی زیادہ ہوگئی تو وہ کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا رہا اور شام ہوگئی۔

اچانک زور سے دروازہ کھُلا اور اُس کا باپ اندر داخل ہُوا۔ وہ بڑا خُوش نظر آ رہا تھا۔ "بیٹے رحمت، تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔" سائیکل کو دیوار کے سہارے کھڑے کرتے ہوئے اُس نے کہا "آج میں ماسٹر صاحب کی دکان پر گیا۔ اُس نے پہلے تو تمہارا حال پُوچھا، پھر مجھے اپنے ایک دوست کے بارے میں بتایا جو ایک بنگلے میں خانساماں کا کام کرتا ہے۔ اُس نے درزی سے ذکر کیا تھا کہ صاحب کو ایک بیرے کی ضرورت ہے۔ درزی نے فوراً تمہارا نام پیش کیا۔"

"رحمت نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا" ابا جی، کیا اُس صاحب کی بیگم خان صاحب کی بیوی کی طرح سخت تو نہیں؟"

"بیٹے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بیٹے پیاس سے دم نکلا جا رہا ہے۔ ذرا پانی تو پلانا۔"

باپ چارپائی پر لیٹ گیا۔ رحمت نے جھٹ گلاس پکڑا اور گھڑے سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بھر کر اپنے باپ کو دیا۔ "لیجئے ابا جی۔"

رحمت کے باپ نے ایک ہی سانس میں سارا پانی پی لیا۔ اور گلاس رحمت کو پکڑاتے ہوئے کہا "مزہ ہی آگیا۔"

گلاس پکڑ کر رحمت چارپائی پر بیٹھ گیا اور پوچھا "ابا جی۔ ماسٹر جی نے اُس صاحب کے بارے میں اور کیا بتایا تھا؟"

"بیٹے، درزی نے بتایا کہ بنگلے میں ایک صاحب ہے اور ایک اُن کی بیگم صاحبہ۔ دونوں کافی عمر کے ہیں۔ اُن کے خانساماں کی بھی کافی عمر ہے اور وہ درزی کا دوست ہے۔ اُن کا پہلا بیرا بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور اُس سے کام نہیں ہوتا تھا، اس لیے وہ چلا گیا۔ اب خان صاحب کو ایک ایماندار چھوکرے کی ضرورت ہے۔ درزی کا یہ خیال ہے کہ صاحب لڑکا اس لیے رکھنا چاہتا ہے کہ وہ ابھی سے اچھی طرح کام سیکھ لے تاکہ جب خانساماں چلا جائے تو یہ لڑکا سارا کام سیکھ چکا ہو اور انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ میرا خیال ہے بیٹے، یہ کام تمہارے لیے بالکل ٹھیک رہے گا۔"

"ابا جی۔ میرا تو دل کرتا ہے کہ آج شام ہم مل کر وہ کوٹھی دیکھ لیں اور اُس صاحب سے بات بھی کر لیں۔" رحمت نے کچھ سوچ کر کہا۔

باپ نے رحمت کی بات مان لی۔ "یہ تو سب سے اچھا ہے۔ درزی نے بھی کہا تھا کہ ہم دونوں آج شام اس کی دکان پر پہنچ جائیں۔ تب وہ ہمیں اپنے اُس دوست کے پاس لے جائے گا اور پھر درزی اور خانساماں دونوں ہماری سفارش کریں گے۔"

اُسی وقت رحمت کی امّی بھی واپس آگئی۔ وہ کافی تھکی ہوئی نظر آرہی

تھی۔ جونہی رحمت کی نظر اپنی امّی پر پڑی۔ وُہ چلّا اٹھا "امّی جی۔ ابّا جی نے میرے لیے ایک نوکری ڈھونڈ لی ہے۔"

ماں نے سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا "کیا کہا بیٹے؟ کہاں نوکری ملی ہے"؟ اور رحمت کے ابّا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ سچ ہے"؟

باپ نے کہا "ہاں رحمت ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اُسے کام مِل جائے۔ آج شام ہم اُس کوٹھی پر جا رہے ہیں" پھر اُس نے وہ ساری بات بتائی۔ جو کہ پہلے اُس نے رحمت کو بتائی تھی۔

رحمت کی امّی نے گہری سانس لی "کاش وُہ صاحب میرے بیٹے کو کام پر لگا لیں۔ اب تو رحمت کو بھی مستقل کام کی ضرورت ہے۔ میرے لیے بھی یہ اچھا ہوگا۔ کیونکہ پھر میں گھر پر ہی رہ سکوں گی اور بچّوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکوں گی۔ بچّے بیچارے بھی سارا دِن اکیلے رہتے ہیں۔ اور یہ اُن کے لیے اچھا نہیں ہے"

اُس نے جھاڑن میں سے بھنڈیاں نکالیں اور انہیں کاٹنے بیٹھ گئی۔

"بشیرہ، آستر اِدھر آؤ۔ بھنڈیاں کاٹنے میں میری مدد کرو"

بشیرہ دوڑ کر چاقو لے آئی اور بھنڈیوں کو چھوٹا چھوٹا کاٹنے لگی آستر نے پرات میں ناپ کر آٹا نکالا۔ اور گلاس میں پانی لے کر آٹا گوندھنے بیٹھ گئی۔

ماں نے چولھے میں آگ جلائی۔ جب وُہ کونے میں سے لکڑیاں لینے لگی تو وہاں گندے کپڑوں کا ایک ڈھیر لگا ہُوا تھا۔ گذرے چھ دنوں سے اُس نے کپڑے نہیں دھوئے تھے لیکن اُس گٹھڑ کو دیکھ کر وُہ مایوس نہیں ہوئی۔ بار بار یہی بات اُس کے دماغ میں گھومتی رہی "کتنا اچھا

ہو اگر رحمت کو یہ کام مل جائے۔"

کھانا کھا لینے کے بعد باپ نے رحمت سے کہا" بیٹا، ابھی وقت ہے ذرا جلدی سے چلیں تاکہ دن دن میں ہی یہ کام ہو جائے۔" رحمت کی ماں نے اُسے ایک صاف قمیض اور پاجامہ دیا۔ رحمت نے نلکے کے نیچے جاکر ہاتھ منہ دھویا اور بالوں کو گیلا کیا۔

اُس کے والد نے بھی اپنے کپڑے جھاڑے۔ سائیکل کو پونچھا اور رحمت کو چھیڑتے ہوئے آواز دی۔

"او میاں، کیا تمہارے تیار ہونے میں ایک مہینہ لگے گا؟"

رحمت نے ہنستے ہوئے کہا" بس آیا ابا جی، صرف دو منٹ۔ ذرا بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کر لوں۔"

پانچ منٹ میں دونوں سائیکل پر سوار ہو کر گلبرگ والی سڑک پر جا رہے تھے۔

آج درزی کا کام بھی وقت سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اُس نے استری سے آگ جھاڑی اور اِدھر اُدھر جو چھوٹی چھوٹی کتریں پڑی تھیں اُنہیں سمیٹا۔ وہ آج خوش نظر آ رہا تھا۔

رحمت اور اُس کے باپ نے بھی درزی کو دُور سے ہی دیکھ لیا تھا۔ نزدیک پہنچ کر دونوں نے بڑے جوش سے اُسے سلام کیا۔

"ماسٹر جی، ہم کچھ جلدی آ گئے۔ لیکن اگر آپ کا کام ختم نہیں ہُوا ہے تو ہم انتظار کر لیتے ہیں۔"

"نہیں بھائی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" درزی نے بڑے پیار سے رحمت کی طرف دیکھا اور کہا" بیٹا شکر ہے تمہیں پھر صحیح و سلامت

دیکھا ہے۔ تم نے واقعی بڑی لمبی بیماری کاٹی ہے۔ میں اُس دن جانتا تھا کہ تمہیں کیا بیماری ہے۔ شکر ہے اب تم ٹھیک ہو۔ مجھے پوری پوری اُمید ہے کہ اُس بنگلے میں تمہیں ضرور کام مل جائے گا۔ بیٹا اب تم بڑے ہو گئے ہو اور اب بازار کا یہ کام تمہارے لائق نہیں ہے۔"

رحمت بھی اپنے دوست کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ "بابا جی، ہاں میں اُس دن کس قدر بیمار اور کمزور تھا۔ لیکن اب تو پھر مضبوط اور تکڑا ہو گیا ہوں۔"

درزی نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے۔ وہ تو نظر ہی آ رہا ہے۔" اس نے اپنی پگڑی سر پر رکھی اور دروازہ بند کر کے تالہ لگا دیا۔ اب تینوں بازار کی پُر رونق بھیڑ میں سے ہو کر آگے بڑھے۔ درزی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید آج آندھی آئے۔ سارا دن سخت گرمی تھی۔ آندھی کے بعد موسم اچھا ہو جائے گا۔"

تینوں برابر برابر چل رہے تھے، درزی سڑک کی دائیں جانب گھوم گیا اور دوسری کوٹھی کے دروازے پر جا رُکا۔ یہ ایک درمیانہ درجہ کی کوٹھی تھی۔ لیکن سامنے کا باغیچہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ "رحمت، یہی وہ کوٹھی ہے۔" درزی نے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹی کے بٹن کو دبایا۔

رحمت کے ابا نے درزی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی، کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ ہم پہلے اُس خانساماں کو مل لیں؟"

"نہیں کوئی بات نہیں۔ صاحب خود ہی اُسے بلوا لیں گے۔"

کوٹھی میں گھنٹی بجی اور ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا دروازے کی طرف

آیا۔" او موتی بس کر۔ چل ادھر۔" کسی کی آواز آئی۔ کوئی دروازے کی طرف آ رہا تھا۔

درزی نے آہستہ سے کہا۔" یہ خانساماں ہی ہے۔" پھر اونچی آواز میں "اقبال جی، میں ہوں ٹیلر ماسٹر۔ دروازہ کھولو۔"

ایک بوڑھے سے آدمی نے دروازہ کھول کر درزی سے ہاتھ ملایا۔

"اقبال بھائی، صاحب اور بیگم صاحبہ گھر پر ہی ہیں نا؟"

"جی ماسٹر جی۔ سناؤ اُس لڑکے کو لائے؟"

درزی نے سر ہلا کر کہا" ہاں۔ ایسا لڑکا ہے کہ چند ہی دن میں سب کام سیکھ جائے گا۔ کیوں ٹھیک ہے نا رحمت؟" درزی نے پیار سے رحمت کی کمر پہ ہاتھ مارا۔

رحمت نے شرما کر سر نیچے جھکا لیا۔ لیکن ایک ہی نظر میں اُس نے خانسامے کو بھانپ لیا تھا۔ اقبال چھوٹے قد کا تھا۔ چھوٹی سی داڑھی تھی اور سفید پگڑی اُس پر بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی اُس کی بھوئیں سفید ہو رہی تھیں اور اُس کی آنکھوں سے نرم مزاجی ٹپکتی تھی۔ رحمت کو صرف ایک چیز کا دکھ ہوا۔ کہ اقبال کی کمر اب جھک رہی تھی۔ اُس نے اپنی قمیض کے اوپر ایک "ایپرن" پہنا ہوا تھا جو کھانا پکاتے وقت پہن لیتے ہیں تاکہ کپڑے گندے نہ ہوں۔

اقبال اُن سب کو اندر لے گیا۔ برآمدے میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُس نے اُن کو وہاں بٹھا دیا اور خود اندر اطلاع کرنے چلا گیا۔ وہ اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔ کہ رحمت معلوم تو ذہین ہوتا ہے۔ اُمید ہے صاحب بھی اُسے پسند فرمائیں گے اور نوکر رکھ لیں گے۔

تھوڑی دیر بعد اقبال واپس آیا۔ اُس کے ساتھ ایک دُبلے پتلے بزرگ تھے۔ وہ تھے تو کافی عمر کے لیکن بانس کی طرح سیدھے تھے۔

تینوں جھٹ اُٹھ کھڑے ہوئے اور تینوں نے اکٹھے ہی سلام کیا "سلام خان صاحب جی"۔

خان صاحب نے سلام کا جواب دیا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ بیٹھ جائیں۔ خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

اقبال نے رحمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "خان صاحب، یہ ہے وہ لڑکا رحمت جس کے بارے میں مَیں نے آپ سے ذکر کیا تھا"۔

رحمت نے شرمائی ہوئی نظروں سے خان صاحب کی طرف دیکھا۔

خان صاحب نے رُومال سے اپنی عینک پونچھتے ہوئے رحمت سے پُوچھا "کیوں میاں رحمت تم نے پہلے بھی کہیں کام کیا ہے"؟

رحمت نے صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا "چند مہینوں سے مَیں مارکیٹ میں موٹریں صاف کرنے کا کام کرتا رہا ہوں۔ اس کے علاوہ مَیں نے اور کہیں کام نہیں کیا ہے"۔

درزی نے سامنے جھکتے ہوئے کہا "خان صاحب، کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے"؟

جب خان صاحب نے سر سے "ہاں" کا اشارہ کیا تو درزی بولا "مَیں رحمت کو خان صاحب، اُس دن سے جانتا ہُوں جس دن وہ مارکیٹ میں پہلی مرتبہ کام کرنے آیا تھا۔ وہ طبیعت کا اچھا اور نیک خصلت بچہ ہے۔ میری صلاح پر اُس نے لکھنا پڑھنا بھی شروع کیا دن کے وقت تو وہ کام کرتا اور شام کے وقت وہ پڑھتا تھا۔ اب وہ اچھی طرح پڑھ

لکھ سکتا ہے۔ یہ اُس کی سب سے بڑی قابلیت ہے۔ آپ اُس پر پوری طرح بھروسہ کر سکتے ہیں۔ وہ اگرچہ عیسائی ہے لیکن خان صاحب، میں اس کی ہر طرح سے ضمانت دینے کو تیار ہوں۔"

خان صاحب کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ "اس کی کوئی بات نہیں کہ وہ کرسچن ہے۔ اقبال سے پہلے بھی ہمارے پاس ایک مسیحی خانساماں تھا وہ بہت شریف اور ایماندار تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کسی اور شہر میں چلا گیا اور اُس کے جانے کا ہمیں بے حد رنج ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں رحمت کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں، میں چاہتا ہوں کہ بیگم صاحبہ بھی اُسے دیکھ لیں کیونکہ بھئی، گھر کے معاملوں میں عورتوں کا آدمیوں سے زیادہ دخل ہوتا ہے۔" خان صاحب اپنی عینک لگا کر ہنسنے لگے۔ پھر اقبال کو بیگم صاحبہ کو بلانے کو کہا۔

ایک منٹ کے بعد بیگم صاحبہ آگئیں۔ اُن کا چھوٹا قد تھا اور اُنہوں نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ بالوں کو جوڑے میں باندھا ہوا تھا اور خان صاحب سے عمر میں بہت کم معلوم ہوتی تھیں۔ صرف چند سفید بال نظر پڑتے تھے۔ صحت میں بھی وہ ٹھیک معلوم ہوتی تھیں۔

جب وہ دروازہ کھول کر باہر آئیں تو آدمیوں کو دیکھ کر کہا "اسلام علیکم" اقبال نے جلدی سے خان صاحب کے قریب ہی ایک کرسی سرکا دی اور وہ بیٹھ گئیں۔

خان صاحب نے انہیں رحمت کے بارے میں بتایا تو اُنہوں نے غور سے رحمت کی طرف دیکھا اور درزی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی، ہمیں ایک ایسے لڑکے کی ضرورت ہے جو شوق سے کام کرے اور ضروری

ہے کہ وہ ایماندار ہو۔ ہم اپنے نوکروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ اس لیے ہم توقع کرتے ہیں کہ وہ بھی اچھی طرح کام کریں۔ ہمیں ایسا آدمی نہیں چاہیئے جو ایک دن تو کام پر آئے اور دو دن غائب رہے۔"

لیکن رحمت کے باپ نے جواب دیا۔ "بے شک بیگم صاحبہ، آپ بالکل درست فرماتی ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ رحمت آپ کے بنگلہ میں بہت خوشی رہے گا۔ وہ تو ابھی بچہ ہی ہے اور آپ اُسے ایک اچھا کام کرنے والا نوکر بنا سکتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ جیسی بھی تربیت اُسے دیں گی، وہ ویسے ہی آپ کی خدمت کرے گا۔"

بیگم صاحبہ نے ہنس کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ بڑی دانا اور عقل مند ہیں۔ "ہاں ہاں بھئی۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے اور پھر یہ تو دیکھا جائے گا کہ لڑکا کتنی جلدی کام سیکھتا ہے۔"

پھر بیگم صاحبہ نے رحمت کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیوں رحمت، ان تمام باتوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا تم ہمارے ہاں کام کرو گے؟"

رحمت ذرا جھینپ سا گیا اور رُکتے رُکتے یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلے۔ "جی..... میں..... جو بھی آپ مجھے سکھائیں گی۔ میں ویسے ہی کروں گا۔ میں دل اور جان سے آپ کی خدمت کروں گا۔"

خان صاحب اور بیگم صاحبہ نے اپنی تسلی کے لیے کافی سوال پوچھے اور جب انہیں تسلی ہو گئی تو انہوں نے رحمت کو اس شرط پر نوکر رکھ لیا۔ کہ وہ دل لگا کر کام کرے گا۔

جب رحمت، اس کا والد اور درزی واپس جا رہے تھے تو سب کے دل خوشی سے بھرے ہوئے تھے۔ رحمت کو حکم مل چکا تھا کہ وہ پیر کے دن

سے کام پر آسکتا ہے۔

جب رحمت اور اُس کے ابّا نے درزی سے رُخصت چاہی تو انہوں نے اُس کا بہت بہت شُکریہ ادا کیا۔ دونوں سائیکل پر سوار ہُوئے اور خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف روانہ ہُوئے۔ رحمت کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ اُس کو اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے ایک اچھی نوکری مل گئی ہے لیکن وُہ دل میں جانتا تھا کہ کس نے اُس کی مدد کی ہے۔ سائیکل پر پیچھے بیٹھے بیٹھے اس نے آنکھیں بند کیں اور کہا۔

"پیارے خُداوند۔ مَیں تیرا شُکریہ ادا کرتا ہوں کہ تجھے میری اتنی فکر ہے اور تُو نے مجھے اتنی جلدی نوکری دی۔ اب میری مدد کر کہ مَیں اُن لوگوں کو یہ بتا سکوں کہ مسیحی کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔"

گیارہواں باب

ایک ہفتہ جلدی سے گذر گیا۔ رحمت اُس دن کا انتظار کر رہا تھا کہ کب وُہ کام پر جائے گا۔ اتوار کی شام کو وُہ خوش تھا اور دل میں سوچ رہا تھا" نامعلوم مجھے کس قسم کا کام کرنا ہوگا۔"

پیر کی صبح باپ اور بیٹا ہمیشہ کی طرح مارکیٹ پہنچے تو باپ نے اُسے وہاں اتار دیا۔ کوٹھی زیادہ دُور نہ تھی۔ وُہ آسانی سے پیدل وہاں تک جا سکتا تھا۔ باپ نے اُسے سمجھا دیا تھا کہ جب شام کو کام ختم ہو جائے تو وُہ بس میں بیٹھ کر واپس گھر آجائے۔

جب اُس نے بنگلے کے دروازے پر لگا ہُوا بٹن دبایا تو اُس وقت پُورے ساڑھے سات بجے تھے۔ کتّا اتنے زور سے بھونک رہا تھا کہ اُسے ڈر لگنے لگا۔ اُسی گھڑی اُس نے خانساماں کی آواز سُنی۔

جب اقبال نے دروازہ کھولا تو رحمت نے بڑے ادب سے اُسے سلام کیا۔

خانساماں نے ہنس کر اُس کے سلام کا جواب دیا اور کہا" شاباش تم

ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ اب میرے ساتھ باورچی خانہ میں آؤ تو میں تمہیں سمجھاؤں گا کہ تمہارا کام کیا ہے۔" وہ اُسے بنگلے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے ایک کمرے میں لے گیا۔ "یہ باورچی خانہ ہے۔ خان صاحب اور بیگم صاحبہ ذرا دیر سے ہی اُٹھتے ہیں۔ وہ بوڑھے ہیں اور خان صاحب کو اکثر نیند نہ آنے کی شکایت رہتی ہے۔ اسی لیے صبح دیر تک لیٹے رہتے ہیں۔ اکثر ساڑھے آٹھ یا نو بجے ناشتہ کرتے ہیں۔ لیکن میرا اور تمہارا کام ٹھیک ساڑھے سات بجے شروع ہو جاتا ہے۔" پھر چولھوں کی طرف اشارہ کیا۔ "اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ انہیں کس طرح جلاتے ہیں۔ بالکل آسان ہے۔ اس بٹن کو ذرا سا گھماؤ اور جلتی ہوئی تیلی اُس طرف کرو۔ دیکھو یہ جل گیا ہے۔"

خانساماں نے سٹوو پر کیتلی رکھ دی اور رحمت سے پوچھا "تمہیں چائے بنانی تو آتی ہے نا"؟

رحمت نے جواب دیا۔ "میں نے اکثر اپنی ماں کو چائے بناتے دیکھا ہے۔ لیکن خود کبھی نہیں بنائی۔"

رحمت کے لیے ہر چیز بالکل نئی تھی۔ اقبال اگرچہ بڑا مہربان اور خوش مزاج تھا لیکن وہ پھر بھی وہ رحمت کے لیے اجنبی تھا۔ اور آج رحمت کا پہلا ہی دن تھا اس لیے وہ کافی شرما رہا تھا۔

"اچھا۔" اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب سے چائے بنانا تمہارا کام ہوگا۔ اب میری طرف دیکھتے رہنا کہ چائے کس طرح بنائی جاتی ہے۔"

اُس نے الماری میں سے چائے دانی نکالی اور رحمت سے کہا۔ "پہلے اس میں گرم گرم پانی ڈالو۔ پھر پانی پھینک دو۔ جب پانی اُبل جائے تو

چائے دانی میں دو چمچ پتی ڈالو اور اُبلتا پانی ڈال کر ڈھکنا لگا دو۔ ڈولی سے دُودھ نکال کر اُبال لو اُسے دُودھ دان میں ڈال دو۔ یہ چینی دان ہے اور یہ ٹرے ہے۔ ٹرے میں کپڑا بچھا کر اس پر ساری چیزیں قرینے سے رکھ دو اور صاحب اور بیگم صاحبہ کو گرم گرم چائے دے دو۔ وُہ گرم چائے ہی پسند کرتے ہیں۔

دو منٹ میں پانی جوش کھانے لگا تو رحمت نے حیران ہو کر کہا۔ "بڑی جلدی پانی اُبل گیا ہے گیس کا تاؤ بہت تیز ہو گا۔"

اقبال نے جھاڑن سے پیالے کو پونچھتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ اِسی لیے سب چیز جلدی پک جاتی ہے۔"

اِس طرح اقبال بڑے تحمل اور پیار سے رحمت کو سارے کام سمجھاتا رہا۔ "اچھا آؤ۔ اب مَیں تمہیں بتاؤں کہ میز کو کس طرح لگاتے ہیں۔" وہ اُسے کوٹھی کے اندر لے گیا۔

میز پر ہر چیز قرینے سے رکھنے کے بعد اقبال نے کہا۔ "جب خان صاحب اور بیگم صاحبہ ناشتہ کر چکیں تو برتن دھو کر ہم بازار چلیں گے۔ وہاں تمہیں بڑی ہوشیاری دکھانی ہو گی۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دکان دار کے داؤ میں آ جاؤ۔ جب میری چھٹی ہو یا کوٹھی میں کام کی زیادتی کی وجہ سے میں بازار نہ جا سکوں تو تمہیں اکیلے ہی جا کر سودا سلف خریدنا ہو گا۔"

صبح کا وقت بڑی ہی اچھی طرح گذر گیا۔ اب سورج چڑھ چکا تھا اور کافی گرمی تھی۔ وُہ دونوں بازار سودا خریدنے روانہ ہوئے۔ سبزی والے کی دکان پر کافی بھیڑ تھی۔ دُوسری کوٹھیوں کے خانسامے، بیرے اور چھوکرے دکان دکان گھوم کر سودا خرید رہے تھے۔

اقبال نے رحمت کو مختلف دکانیں دکھائیں اور پھر ایک دکان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "یہاں سے ہم ڈیڑھ پاؤ ٹماٹر خریدیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں وہ تمام دکانیں دکھاؤں گا۔ جہاں سے میں اکثر سودا خریدتا ہوں۔ رحمت میں ہمیشہ بہترین چیز خریدتا ہوں لیکن اس بات کی بڑی ہوشیاری کرنی چاہیئے کہ دکاندار اس کے لیے ٹھیک ٹھیک قیمت لگائے۔ تمہیں بھی یہی کرنا ہوگا"۔

رحمت نے بڑے ادب سے کہا "میں پوری پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملے"۔ رحمت نے اقبال کی سائیکل تھامی ہوئی تھی۔ اور دونوں باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ اقبال نے کہا "اس ہفتہ تو میں تمہارے ساتھ آیا کروں گا، لیکن اگلے ہفتہ سے تم اکیلے ہی بازار جایا کرو گے۔ تم میری سائیکل استعمال کر سکتے ہو۔ ارے ہاں! تمہیں سائیکل چلانا تو آتا ہے نا"؟

رحمت نے ایک دم جواب دیا "جی چلا لیتا ہوں"۔

"رحمت۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں ہر چیز کی قیمت جانتا ہوں۔ میں گاہے بگاہے خود بھی بھاؤ دریافت کرتا رہوں گا۔ اچھا، آؤ اب سبزی خریدیں"۔

سبزی والے نے انہیں دیکھتے ہی ہنس کر کہا "اسلام وعلیکم میاں اقبال صاحب۔ مزاج بخیر"۔

"وعلیکم اسلام۔ نوازش ہے۔ مہر جی۔ ان ٹماٹروں کا کیا بھاؤ ہے"؟

اجی آپ کی اپنی دکان ہے۔ جو مرضی ہو دے دیں۔ آپ سے صرف بارہ آنے سیر لوں گا"۔

"اچھا تو ڈیڑھ پاؤ دے دو۔" اقبال نے احتیاط سے ٹماٹر تھیلے میں رکھ لیے اور سبزی والے سے کہا۔ "اگلے ہفتے سے یہ لڑکا آیا کرے گا۔ اِس کا نام رحمت ہے۔"

"کوئی بات نہیں سرکار۔ آپ آئیں یا نہ آئیں، چیز ہمیشہ ستھری دُونگا۔ فکر نہ کریں بالکل۔"

"بھئی ذرا بھاؤ خیال سے لگانا۔ نیا سمجھ کر داؤ پیچ نہ کھیلنا۔"

سبزی والے نے ہنستے ہُوئے کہا۔ "بادشاہو۔ کبھی ایسا ہو سکتا ہے!!!"

"اچھا رحمت، اب ہم وُہ سامنے کونے والی دکان پر جائیں گے۔ وہاں انڈے اور گوشت مِلتا ہے۔ اس کے بعد ہم واپس چلیں گے۔ ہاں رحمت، مجھے یاد دلانا ایک اچھی سی کاپی بھی خریدنی ہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ وُہ مختلف کھانے بنانے کے طریقے اس میں لکھائیں گی۔"

رحمت نے حیران ہو کر پُوچھا۔ "کاپی میں کیوں لکھائیں گی"؟

اقبال نے جواب دیا۔ "کیا تم نے کبھی کوئی ایسی کتاب نہیں دیکھی جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں؟ بیگم صاحبہ اسی قسم کی ایک اپنی کاپی بنانا چاہتی ہیں۔ فرض کرو ایک کھانا تمہیں پہلی بار بنانا سکھایا جاتا ہے اور پھر وُہ کتاب میں بھی لکھا ہو تو دوسری بار جب تمہیں وہی چیز اکیلے بنانی پڑے تو تم اپنی کاپی میں سے وہ ترکیب نکال کر پڑھ سکتے ہو اور وُہ کھانا آسانی سے بنا سکتے ہو۔ ہمارے صاحب لوگ بہترین خوراک کھاتے ہیں۔ وُہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کھانا لذیذ پکا ہُوا ہو۔"

رحمت نے ایسے سر ہلایا جیسے وُہ کوئی بہت مُشکل بات سمجھ گیا ہو۔

"تو یہ بات ہے۔ میاں جی ایک بات پوچھوں۔ یہ ہمارے صاحب اکیلے کیوں رہتے ہیں؟ اِن کے بچے کہاں ہیں"؟

"ان کا ایک لڑکا ہے جو کراچی کی ایک مل میں منیجر ہے۔ اُس نے تو کئی بار انہیں کہا ہے کہ وُہ کراچی چلیں، لیکن خان صاحب کو اس بنگلے سے بڑا اُنس ہے۔ منیجر اور اُس کے بیوی بچے سال میں دو مرتبہ آتے ہیں۔ اُس وقت کوٹھی میں خوب رونق ہوتی ہے۔ اُن کے چار بچے ہیں۔ وُہ سارا دِن ہلّا گُلا مچائے رکھتے ہیں۔" اقبال نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا "گیارہ بجنے والے ہیں۔ جلدی چلو۔ کوفتے بنانے ہیں تو بڑا وقت چاہیئے۔"

اقبال سائیکل چلانے لگا اور رحمت پیچھے بیٹھ گیا۔ راستے میں رحمت نے پیچھے بیٹھے ہوئے پوچھا: "میاں جی، آپ رہتے کہاں ہیں"؟

"میں خان صاحب کی کوٹھی میں ہی رہتا ہوں۔ میرے چار بچے ہیں۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ لیکن میں علیحدہ رہنا ہی پسند کرتا ہوں۔ بچے جوان ہیں اور شادی شدہ ہیں۔ دو سال ہوئے میری بیوی فوت ہوگئی۔ جب تک میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں، میں بچوں پر بوجھ بننا نہیں چاہتا۔ پھر یہاں خان صاحب اور بیگم صاحبہ بھی تو ہیں۔ جنہیں میری بڑی ضرورت ہے۔ اس بڑھاپے میں وُہ بالکل اکیلے نہیں رہ سکتے۔ بس اس طرح ہم سب کا گذارہ چل رہا ہے۔ مجھے جگہ ملی ہوئی ہے اور انہیں ایک ایسا ملازم جو چوبیس گھنٹے اُن کی خدمت میں موجود رہتا ہے۔"

"میاں جی، کیا آپ اس بڑی سی کوٹھی میں ہی رہتے ہیں؟"

"ارے نہیں پگلے۔ باورچی خانے کے برابر میں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ پہلے

وہ گودام تھا لیکن اب میں اس میں رہتا ہوں۔"

رحمت کے سوال ابھی تک ختم نہیں ہوئے تھے۔ "میاں جی کیا آپ کے بچے آپ کو مجبور نہیں کرتے کہ آپ اُن کے ہی پاس رہیں"؟

اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ تو بے حد ضد کرتے ہیں کہ میں کام چھوڑ کر بس اب اُن ہی کے پاس رہوں، لیکن میری ضمیر مجھے اِس کی اجازت نہیں دیتی جب تک میں کام کر سکتا ہوں۔ کیوں نہ کروں۔ اور کیوں خواہ مخواہ ان کی روٹیاں توڑوں۔ لیکن بھئی جب وقت آیا اور مجھ سے کام نہ ہو سکا تو پھر مجبوری ہو گی کہ اُن کے دروازے پر جاؤں۔"

رحمت کے دل میں اقبال کے لیے اور بھی زیادہ عزت ہو گئی۔ اب وہ اپنے بنگلے پہنچ گئے۔ اقبال نے سایہ میں اپنی سائیکل کھڑی کر دی۔ رحمت سودے کا تھیلہ اُٹھائے ہوئے تھا۔ "آؤ رحمت باورچی خانے میں چلیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ ہم اپنے ہاتھ اچھی طرح صابن سے دھوئیں۔ راستہ میں گرد و غبار ہوتا ہے۔ ہم اِدھر اُدھر ہاتھ لگاتے پھرتے ہیں۔ سبزیاں بھی گندی ہوتی ہیں جنہیں ہم چھوتے ہیں۔ اگر کام کرنے سے پہلے ہم ہاتھ نہ دھوئیں تو وہ تمام گند کھانے میں مل جاتا ہے۔ اگر تم ایک اچھا خانساماں یا بیرا بننا چاہتے ہو تو یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ تمہارے ہاتھ ہمیشہ صاف ہوں۔ چاہے تمہیں کوئی دیکھ رہا ہو، یا نہ دیکھ رہا ہو۔"

رحمت نے اچھی طرح اس بات کو ذہن نشین کر لیا۔ اور مسکراتے ہوئے اقبال کی طرف صابن بڑھا دیا۔ دونوں نے رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھ دھوئے۔ اُسی وقت بیگم صاحبہ کی آواز آئی۔ "اقبال آ گئے بازار سے؟ ذرا چائے تو بناؤ۔" یہ کہتے کہتے بیگم صاحبہ باورچی خانہ میں آ گئیں۔ رحمت کی طرف

دیکھ کر مسکرائیں اور کہا "اچھا تو یہ ہے ہمارا نیا بیرا۔ اقبال، اسے کام تو سمجھا رہے ہو نا؟ اُمید ہے تم دونوں میں اچھی نبھے گی۔"

رحمت نے جُھک کر بیگم صاحبہ کو سلام کیا اور نیچی نظریں کئے کھڑا رہا۔

"اقبال، دو مہمان آئے ہوئے ہیں۔ چار کی چائے بنا کر گول کمرے میں لے آنا۔"

اقبال نے بہت اچھا حضور کہا۔ جلدی سے سفید ایپرن پہنا۔ رحمت نے سٹوو جلا کر کیتلی اُوپر رکھ دی۔ "رحمت اتنی دیر کہ پانی اُبلے، آؤ ہم چار آدمیوں کے لیے پیالے لگائیں۔ وہاں سے ٹرے پکڑو۔ اُس میں چار پرچ پیالے لگاؤ۔ چمچ اس دراز میں ہیں۔ اس الماری میں بسکٹ اور دوسری کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔

اس طرح پہلا دن گذر گیا۔ رحمت کو یہ کام پسند آیا۔ سب اُس پر مہربان تھے۔ اقبال کا سلوک بھی اُس سے بہت ہی اچھا تھا۔ اگر وہ کوئی بات بھول جاتا تو اقبال ہنستے ہوئے اُسے سمجھاتا۔

گھر میں فرصت کے وقت وہ کاپی کھول لیتا اور بار بار یہ پڑھتا کہ کوفتے یا دوسری چیزیں کیسے بنائی جاتی ہیں۔ اُس نے دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ ہر کام بڑی احتیاط اور خبرداری سے کرے گا تاکہ جلد از جلد اقبال بابا کی طرح وہ بھی خود ہی سارے کام کاج کرنے لگ جائے۔

دن گذرتے گئے۔ اور وہ اپنے کام میں مہارت حاصل کرتا گیا، اب وہ اکیلا ہی بازار جاتا اور اچھی اور سستی چیزیں خریدتا۔ کئی بار اُس کے سامنے آزمائش آئی۔ لیکن وہ ہر امتحان میں پورا اُترا۔

ایک صبح وہ سائیکل پر مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کی قمیض کی جیب میں ایک کاغذ تھا جس پر سودے کی تفصیل لکھی ہوئی تھی کہ اُسے کیا کیا خریدنا ہے۔ مارکیٹ سے ذرا دُور وُہ سائیکل سے اُتر گیا اور لسٹ دیکھنے لگا۔

چھ انڈے، چھ کیلے، ایک پاؤ ٹماٹر، ایک پاؤ گوشت، ایک سیر آلو، ایک پونڈ چائے اور بوتل سرکہ۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے پہلے سبزی خریدے گا۔ سبزی والے کی دُکان پر ٹماٹر کا بھاؤ پوچھا۔ دکاندار نے ایک بڑا سا لال ٹماٹر اُسے دکھاتے ہوئے کہا: "ڈیڑھ روپیہ سیر۔ بابو جی، ایسے ٹماٹر آپ کو سارے لاہور میں نہیں ملیں گے۔ ایک روپیہ چھ آنے سیر والے بھی ہیں۔ لیکن آپ تو ہمیشہ بہترین چیز لیتے ہیں۔"

ابلیس نے رحمت کے کان میں آہستہ سے کہا "اُس ٹوکری میں سے جس میں ایک روپیہ چھ آنے سیر والے ٹماٹر ہیں۔ بڑے ٹماٹر چھانٹ لے۔ کون دیکھتا ہے۔ دو آنے تیرے ہو جائیں گے۔"

رحمت نے مُنہ بناتے ہوئے کہا "میں ذرا اور سودا لے لُوں۔"

دُوسری دکانوں پر بھی اُس نے ٹماٹر دیکھے لیکن ڈیڑھ روپیہ سیر والے ٹماٹروں کا کوئی بھی مقابلہ نہ تھا۔ انڈے والی دکان پر بھی دو قسم کے انڈے تھے۔ ایک سوا دو روپیہ درجن اور قدرے بڑے انڈے اڑھائی روپے درجن۔ اُس نے دل میں کہا: "انڈے کیا چھوٹے کیا بڑے۔ ہیں تو سب انڈے ہی۔ کل جو میں نے بڑے بڑے انڈے خریدے تھے۔ وُہ بھی تو ان سوا دو روپیہ درجن والے انڈوں کی مانند تھے۔"

اُس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "دو آنے انڈوں میں سے بچے دو آنے ٹماٹروں میں سے بچے۔ چار آنے ہوئے۔ چار آنے

ابّو نے دیئے تھے۔ "بس ہو جائے پھر ایک کنگ سائز کا کوکا کولا۔ مزہ ہی تو آجائے گا۔"

شیطان اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ اُس نے بے ایمانی کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا کہ رحمت کو بے ایمانی بے ایمانی نہ لگی۔

جب وہ سستے انڈے خریدنے آگے بڑھا تو ایک نامعلوم طاقت نے اُس کا ہاتھ روک دیا۔ اُسے کچھ محسوس ہُوا کہ وُہ ایک بہت غلط کام کرنے والا ہے اُسے ایک آواز آئی۔ "کوکا کولا کا صرف ایک منٹ کا مزہ ہوتا ہے لیکن بے ایمانی کا گُناہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذمہ لگ جائے گا۔"

اُسے بڑا ہی افسوس ہُوا کہ اُس نے ابلیس کی باتوں کو اپنے دِل میں آنے دیا۔ اُس کے دِل پر چوٹ لگی۔ اُس نے اڑھائی روپیہ دیہہ جن والے انڈے اور ڈیڑھ روپیہ سیر ٹماٹر خریدے۔ پیاس بجھانے کو نلکے سے پانی پیا۔ اب وہ خوش تھا کہ عین وقت پر خُدا وند یسوع نے اُسے آگاہ کیا اور اس آزمائش پر غالب آنے کی طاقت بخشی۔ سوچنے لگا۔ "واقعی میرا دوست میری بہت حفاظت کرتا اور بدی پر غالب آنے میں میری مدد کرتا ہے۔"

جب وُہ سائیکل پر کوٹھی کی طرف جا رہا تھا اُسے اس بات کا پھر احساس ہُوا کہ اُسے اور زیادہ کلام پڑھنے کی ضرورت ہے۔ کچھ نہ کچھ تو وُہ انجیل پڑھ لیتا تھا۔ لیکن بہت سی باتیں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اِس لیے اُس نے پکا ارادہ کر لیا کہ چھٹی والے دِن وہ ضرور بابا لال کے گھر جائیگا تاکہ ان باتوں کا مطلب سمجھ سکے۔

اگلے ہفتے اُسے بڑی ہی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اتوار کے دِن اچانک

ہی کراچی سے خان صاحب کا بیٹا اور اُس کے بیوی بچے آ گئے۔ اور اُسے اتوار کے دِن بھی پُورا کام کرنا پڑا۔

شام کو جب وہ گھر پہنچا تو اُس کا دِل بجھا بجھا سا تھا۔ لیکن صحن میں داخل ہوتے ہی ابّا نے خوشی سے اُسے بتایا۔ "کیوں بیٹے، شادی پر چلوگے"؟

رحمت تھکا ہُوا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے ہُوئے پُوچھا۔ "کس کی شادی ہے"؟

باپ نے کہا۔ "بیٹے تم شاید اُسے نہیں جانتے وہ ہمارا دُور کا رشتہ دار ہے۔"

"ابّا جی۔ ان کا نام کیا ہے"؟

"پطرس۔ آج صبح ہی وہ ہمیں دعوت دے گیا ہے۔"

"مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ لیکن خیر ابّا جی۔ مَیں نہیں جاسکوں گا۔ خان صاحب کا بیٹا اور بیوی بچے آئے ہوئے ہیں۔ بچارے اقبال سے کہاں اِتنا کام ہو سکتا ہے۔ مجھے تو صبح کام پر جانا ہوگا۔"

ماں نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ "بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ آج تمہاری چھٹی کا دِن تھا۔ لیکن تم نے سارا دِن کام کیا ہے۔ اب آج کے بجائے تمہیں کل چھٹی ملنی چاہیئے۔"

باپ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا۔ "تمہاری ماں ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ تم کل چھٹی کر دو جی۔ آخر اتنی مدّت بھی تو اقبال اکیلا کام سنبھالتا ہی رہا ہے نا۔ ایک دِن میں کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا"؟

"تو ابّا جی پھر مجھے کوٹھی جاکر ایک دِن کی چھٹی لینی چاہیئے۔"

"ارے بیٹے، جتنے سوال ہوتے ہیں اتنے ہی اُس کے جواب بن سکتے

ہیں۔ رہنے دو۔ اگر پرسوں وہ پوچھیں تو کہہ دینا میں بیمار ہو گیا تھا اور بس۔"

کاش رحمت کے والدین کو اس کا ذرا سا بھی خیال ہوتا کہ وہ اپنے بیٹے کو کتنی غلط نصیحت کر رہے ہیں۔ لیکن نہیں، اُن کے کانوں میں تو آج تک خدا کی تنبیہ کی آواز کبھی آئی ہی نہ تھی۔ نہ ہی انہوں نے خداوند یسوع کو اپنی زندگی میں جگہ دی تھی۔ اِس لیے جھوٹ بولنے سے وہ ذرا بھر نہ ہچکچاتے تھے۔

لیکن رحمت ایسا نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسا کرنا بالکل غلط ہے۔ لیکن پھر بھی اُس نے اپنی ماں اور اپنے باپ کی بات مان لی۔ اور شادی پر چلا گیا۔ لیکن اُس کے دل میں چین نہیں تھا۔ دل میں ایک عجیب سی کشمکش تھی۔ اِس لیے اُسے شادی میں آنے کی کوئی خوشی نہ ہوئی۔ بس وہ اقبال کے بارے میں ہی سوچتا رہا کہ وہ اُس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔ لیکن اُس نے کیسے عین کام کے وقت اُسے دھوکہ دیا۔

اس کے ماں باپ تو اُسے ایک اور دن بھی وہاں ٹھہرانا چاہتے تھے لیکن رحمت اس بات پر ہرگز راضی نہ ہوا بلکہ الٹا کافی غصّہ میں آ گیا۔ اب اُس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ اُسے واپس لاہور بھیج دیا جائے۔ اُس کی ماں اور بھائی بہنیں تو وہاں ہی رہ گئیں۔ رحمت اپنے باپ کے ساتھ واپس آ گیا۔

دوسری صبح جب رحمت کام پر گیا تو وہ بے حد رنجیدہ تھا۔ اُس نے بڑی بے دلی سے اقبال کو سلام کیا۔

"آ گئے؟ کل کہاں رہ گئے تھے بیٹے؟ کیا بیمار تو نہیں تھے؟ شاید ابھی تک تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مُنہ بڑا زرد اور اُترا ہوا

ہے۔" اقبال نے بڑی ہمدردی دکھائی۔

اقبال کے اِن ہمدردانہ الفاظ نے جیسے رحمت کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ وہ دِل ہی دل میں اپنے کو کوس رہا تھا۔" اے بیوقوف رحمت تو کتنا بزدل ہے۔ خدا وند مسیح کیا خیال کرے گا"!

شام کو بیگم صاحبہ نے اُسے دو دن کی چھٹی دے دی۔ اُنہوں نے بڑی ہمدردی سے کہا۔" بیٹے، تم نے اتوار کو چھٹی نہیں کی تھی۔ اب دو دن گھر پر آرام کرو۔ اچھا"۔

رحمت دِل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔" اب تو دو دِن کی چھٹی ہے۔ مَیں کوشش کرکے بابا لال کو ضرور ملوں گا۔

صبح تو رحمت اِدھر اُدھر گھومتا پھرا۔ جب دوپہر ڈھل گئی تو وہ اچھرہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ بابا لال کا مکان ڈھونڈنے میں اُسے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ بابا جی وہاں ایک عرصہ سے رہ رہے تھے۔ اور بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔

اُس نے دروازہ پر دستک دی۔ کمرے کے اندر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ اور پھر دروازہ کھُلا۔

بابا لال بڑی حیرانی سے رحمت پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ خوشی میں وہ پکار اُٹھا" میرے بیٹے۔ میرا خیال تھا شاید تم مجھے بھول گئے ہو۔ اندر آ جاؤ بیٹے"۔

رحمت بھی ہنس دیا اور کہا" آپ تو مجھے دیکھ کر گھبرا ہی گئے"!

" لیکن بیٹے تمہارے آنے کی مجھے دِلی خوشی ہے"۔ بابا نے پیار سے رحمت کو اپنے بازو میں لے لیا اور اندر لے گئے" اتنی مدت تم رہے

کہاں! کہیں گھر میں تو نہیں چھپکے بیٹھے رہے"؟

"نہیں بابا جی، گھر میں اکیلے بیٹھنا میرے لیے سب سے مشکل کام ہے بات یہ ہے کہ مجھے ایک بنگلے میں بیرے کی نوکری مل گئی ہے۔ اب تک مجھے ہفتہ وار چھٹی نہیں ملی تھی۔ اس لیے میں آپ کے پاس نہ آسکا"۔

رحمت کی یہ بات سُن کر بابا لال کو بڑی ہی خوشی ہوئی۔ "بیٹے، یہ تمہارے لیے خُداوند کی کتنی بڑی بخشش ہے"۔

دونوں صحن میں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بابا لال نے اپنی بہو کو آواز دی کہ وُہ اُن کے لیے چائے بنائے۔

بہُو نے جلدی جلدی چائے بنا کر اُن کے سامنے رکھ دی اور پھر کپڑے دھونے میں لگ گئی۔

رحمت خوش تھا کہ وہ باتیں کرنے یا سننے وہاں نہیں بیٹھ گئی۔ بلکہ انہیں تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ تاکہ وہ اپنی باتیں کر سکیں۔ رحمت کو اب تک بڑی بے چینی سی تھی۔ وُہ بار بار اپنی قمیض کے کنارے کو مروڑتا اور سیدھا کرتا۔ آخر اُس نے ہمت کر کے یوں بات شروع کی۔ "بابا جی، میں جانتا ہُوں کہ خُداوند یسُوع مجھ سے بہت ہی زیادہ ناراض ہے۔ جس خانساماں کے ساتھ میں اس بنگلے میں کام کرتا ہوں، اُس کو مَیں نے دھوکا دیا اور جھوٹ بھی بولا اور اب میں بہت ہی رنجیدہ ہُوں۔ بابا جی بتائیں کہ اب میں کیا کروں۔ میں سخت مُصیبت میں پھنسا ہُوا ہوں"۔

"بابا نے رحمت کی طرف دیکھا جو بہت گھبرایا ہُوا نظر آرہا تھا۔ "بیٹے، مجھے ساری بات بتاؤ کہ کیا ہُوا اور کیا نہیں ہُوا"۔

تب رحمت نے ساری کی ساری کہانی بابا جی کو سُنا دی۔ بابا بڑے

تحمل سے اُس کی بات سُنتے رہے پھر اُنہوں نے رحمت کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹا مجھے بڑا دکھ ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اکثر ایسے واقعات پیش آ ہی جاتے ہیں۔ تم یہ بالکل نہ سوچو کہ خُداوند مسیح تم سے ناراض ہے یا وہ اب تمہیں پیار نہیں کرے گا۔ شاید پہلے دقتوں میں بھی تم جھوٹ بولتے رہے ہو گے لیکن کبھی تمہیں اس بات کا خیال نہیں آیا ہو گا۔ کہ تم نے جھوٹ بولا۔ لیکن جس دن سے تم نے خُداوند کو اپنے دِل میں جگہ دی ہے اُس کے بعد سے وُہ خود اب تم سے بات کرتا ہے۔ اب تمہیں چاہیئے کہ اُس کی بات غور سے سنو اور اُس کی تابعداری کرو۔ چاہے تمہارے ماں باپ، تمہاری کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کریں۔"

رحمت کو قدرے تسلی ہوئی، لیکن پھر بھی اُس نے کہا۔ "چونکہ میں نے اُس کی آواز کو نہیں سُنا، تو کیا اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ اے پیارے یسوع مجھے اپنی غلطی پر بہت ہی افسوس اور رنج ہے"؟

"یہی اصلی چیز ہے۔ بیٹے مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم نے اپنے گناہ کا اقرار کر لیا ہے، کیونکہ یہ ضروری بات ہے۔ اس کے بعد لازم ہے کہ تم خُداوند سے معافی مانگو۔ اب ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ تم نے خانساماں سے جھوٹ بولا ہے۔ اس لیے اب تم پر یہ فرض ہے کہ تم اس سے بھی معافی مانگو۔"

بابا نے چارپائی پر سے اپنی بائبل اُٹھائی، شاید وُہ رحمت کے آنے سے پہلے وہاں ہی بیٹھے بائبل پڑھ رہے تھے۔ "دیکھو رحمت، یہاں یُوحنا کے پہلے خط میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ دیکھو یُوحنا کے پہلے خط کے پہلے باب کی نویں آیت کیا کہتی ہے۔ "اگر اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو وہ ہمارے گناہوں کے معاف کرنے اور ہمیں ساری ناراستی سے پاک

کرنے میں سچا اور عادل ہے۔"

رحمت گہری سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اُس نے کہا: "بابا جی دراصل اپنی زبان سے تو میں نے ایک لفظ بھی نہیں نکالا کہ مَیں بیمار تھا۔ میں تو چُپ چاپ تھا۔ خانساماں ہی سوچ رہا تھا کہ شاید میں بیمار تھا کیونکہ میرا رنگ زرد تھا۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا تم نے صاف لفظوں میں انکار کیا تھا کہ تم بیمار نہیں تھے؟"

رحمت اپنے دل میں سخت پشیمان تھا۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اب کس مُنہ سے وہ بابا اتبال کے پاس جائے اور اتنے دنوں کے بعد اپنی غلطی کو مانے۔ وہ کیا کہے گا؟"

رحمت تم اس کا انکار نہ کرو کہ خانساماں کیا کہے گا یا کیا سوچے گا۔ صرف اس چیز کو سوچو کہ جب تم اپنی غلطی کو مان کر اُس کا اقرار کرو گے اور اُس کی معافی مانگو گے تو خداوند مسیح اس سے کتنا خوش ہوگا۔ جب تم اپنی غلطی کا اعتراف کرو تو خداوند سے دُعا کرنا نہ بھولنا کہ وہ اُس وقت تمہیں ہمت اور دلیری بخشے۔ رحمت، مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کرنے سے تم خداوند کے ساتھ اپنے رشتہ اور تعلق کو بے حد مضبوط بنا دو گے۔ اس طرح تم آئندہ کسی اور موقع پر بھی جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کرو گے۔

بابا نے رحمت کا خالی پیالہ اور اپنا پیالہ اٹھایا اور انہیں اندر چھوڑ آئے۔ جب وہ واپس آرہے تھے تو کہی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے۔ "رحمت بیٹے، مَیں ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تم سنڈے سکول جایا کرو تو یہ تمہارے لیے بہت ہی اچھا ہوگا۔ سچے اور ایماندار مسیحیوں کے ساتھ تعلق رکھنا بھی بہت ضروری بات ہے۔ تم سنڈے سکول میں بائبل کی باتوں

کو سیکھ سکتے ہو۔ اور دوسروں سے رفاقت بھی رکھ سکتے ہو۔ ہمارے اکٹھے ہونے، مل کر دعا کرنے اور حمد و تعریف کے گیت گانے سے نہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک خاندان ہیں اور سب مل کر خدا کی حمد اور شکر گذاری کر رہے ہیں۔"

"آپ نے درست فرمایا بابا جی۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہاں نزدیک کوئی سنڈے سکول ہے؟" بابا نے ہاتھ کے اشارے سے کہا: "ایک تو ہمارے گھر کے بالکل ہی نزدیک ہے۔ اگر تم وہاں جانا چاہو تو میرا بھتیجا تمہیں وہاں لے جائے گا۔ وہ بھی اُسی سنڈے سکول میں جاتا ہے۔"

"کیا آپ کا بھتیجا عمر میں مجھ سے بڑا ہے بابا جی"؟

"نہیں رحمت، شاید تمہارا ہم عمر ہی ہو۔"

"تو میرا خیال ہے کہ بابا جی، اگلے اتوار میں آپ کے ہی گھر آجاؤں گا۔ اگر مجھے کچھ کام نہ ہوا تو....." رحمت کی دلی خواہش تھی کہ وہ اس سنڈے سکول میں داخل ہو جائے۔ اور بابا جی کے بھتیجے کو بھی مل لے۔ وہ بابا جی کے بھتیجے سے دوستی کے خیال سے نہیں بلکہ سنڈے سکول میں خداوند یسوع کے بارے میں زیادہ جاننے کا خواہش مند تھا۔

بابا بھی بڑے خوش تھے کہ رحمت ان کے پاس آیا۔ انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ ان کے کہنے پر رحمت رضامند ہو گیا تھا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو خانساماں سے اپنی غلطی کی معافی مانگے گا۔ "اچھا میرے بیٹے اب ہم دعا کرتے ہیں اور اس کے بعد تم بابا اقبال کے پاس جانا اور اس سے صاف صاف ہر ایک بات جو تم نے کہنی ہے، کہہ دینا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس سے تمہیں ایک بار پھر بہت ہی زیادہ خوشی حاصل ہوگی۔"

رحمت نے ٹھنڈی سانس لی لیکن دل میں قصد کر لیا تھا کہ اگر ایسا کرنا ضروری ہے تو وہ ضرور ایسا ہی کرے گا۔

تب باباجی نے اُس کے ساتھ دُعا کی اور پھر اُسے بس سٹاپ تک چھوڑ آئے۔ ذرا دیر بعد انہیں دُور سے ایک بس نظر آئی۔ نزدیک آنے پر معلوم ہُوا کہ وُہ گلبرگ جانے والی ہی بس تھی۔ رحمت بس میں سوار ہُوا اور باباجی کو سلام کر کے آخری سیٹ پر جا بیٹھا۔ آج اُسے پہلی بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ گناہ کا اقرار کرنا کتنی مشکل چیز ہے اور کتنی بہادری کا کام ہے۔

چونکہ یہ کام اُسی دن کرنا تھا۔ اِس لیے رحمت بھی اب چاہتا تھا کہ کس قدر جلد ممکن ہو وہ یہ کام کرے۔ بس ایک سٹاپ پر رُکی۔ کچھ مسافر اُترے کچھ چڑھے۔ اُترنے والوں میں رحمت بھی تھا۔ خان صاحب کا بنگلہ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ دروازے پر کتا زور سے بھونکا لیکن رحمت کو دیکھتے ہی دُم ہلانے لگ گیا۔ اب وُہ اس سے مانوس ہو چکا تھا۔ کیونکہ رحمت روز اُسے دوپہر کو روٹی دیتا تھا۔

ابھی تک تو رحمت کے دل میں تسلی تھی لیکن جوں جوں وُہ باورچی خانے کے قریب ہو رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں اُس کے دِل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی اور اُس کے پاؤں لرز رہے تھے۔

اب اُسے باورچی خانے میں دیگچی میں چمچ چلانے کی آواز آئی۔ بابا اقبال ضرور شام کے لیے کھانا تیار کر رہا تھا۔ بڑی ہی مزیدار خوشبو آئی۔ اقبال کوئی بہت ہی عمدہ چیز تیار کر رہا تھا۔ رحمت نے جالی دار دروازے کے قریب مُنہ لا کر کہا "میں اندر آجاؤں؟"

اقبال نے پیچھے گھومتے ہوئے کہا "کون ہے؟ اندر آجاؤ۔"

"ارے تم رحمت۔ کیا خیر تو ہے! آج چھٹی والے دن تم یہاں کیسے!
سناؤ چھٹی کیسے گذاری! بیٹے ذرا ڈالڈے کا ٹین تو مجھے پکڑانا۔"
بابا اقبال نے دیگچی میں گھی ڈالا اور چمچ سے ہلاتا رہا۔ رحمت خاموشی سے
اُس کے پیچھے کھڑا ہُوا تھا۔ اُسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے گلے میں
پھندا لگا ہُوا ہے۔ ہائے وُہ کیسے شروع کرے۔ آخر اُس نے رُکتے رُکتے
کہا "ب..... ب..... با..... باجی۔"
"کیوں بیٹے خیریت تو ہے"! بدستور چمچ چلاتے ہُوئے بابا اقبال نے
پوچھا۔
"نہیں..... میرا مطلب ہے ہاں۔ بابا جی مَیں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا
ہُوں"۔ رحمت کا دل بدستور دھڑک رہا تھا۔ آخر اُس نے دلیری سے صاف
صاف لفظوں میں کہا "بابا اقبال جی۔ چند دن ہوئے مَیں نے آپ سے جھوٹ بولا
تھا۔ اور آج مجھے اُس کا بہت ہی افسوس ہے"۔ اب رحمت کی آواز صاف ہو
چکی تھی۔ لیکن اُس میں ابھی تک بابا کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔
بابا نے دیگچی نیچے اتار دی۔ اب وُہ رحمت کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔
اپنے ہاتھوں کو ایپرن سے پونچھتے ہُوئے اُس نے کہا "کیا تم نے واقعی مجھ سے
جھوٹ بولا! کب اور کس دن! جب تم کام پر نہیں آئے تھے!"
رحمت زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن کبھی کبھی وہ بابا کی طرف بھی دیکھ لیتا
"بابا جی یہ اُس دن کی بات ہے جس دن خان صاحب کا بیٹا اور اُس کے
کے بیوی بچے آئے ہوئے تھے۔ اُس دن میں دراصل بیمار نہیں تھا بلکہ ایک
شادی پر گیا ہُوا تھا۔"
"ہاں رحمت، شک تو مجھے بھی اُس دن تھا"۔ اقبال نے اپنی داڑھی کھجلاتے

ہوئے کہا۔ "لیکن اب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ یہاں تو کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔"

"بابا جی۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں کہ میں پکا مسیحی بنا ہوں۔"

بابا نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "ارے! کیا تم ایک مسیحی گھر میں پیدا نہیں ہوئے تھے؟"

"نہیں بابا جی۔ جس دن میں ایک مسیحی گھر میں پیدا ہوا تو اُس دن تو مجھے صرف مسیحی نام دیا گیا تھا۔ میں بڑا ہوتا گیا لیکن مجھے خدا یا اُس کے بیٹے خداوند یسوع کا کچھ معلوم نہ تھا۔ جب میں بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوا تو وہاں میری ملاقات ایک سچے مسیحی سے ہوئی اور اُس نے مجھے بھی ایک سچا مسیحی بننے میں مدد دی ہے۔ اب میں ایک سچے مسیحی کی طرح زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔ اب مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اُس دن کام چھوڑ کر مجھے اُس شادی پر ہرگز ہرگز نہیں جانا چاہیئے، اور مجھے اُس بات کا بہت ہی زیادہ افسوس ہے۔"

بابا اقبال بڑے غور سے رحمت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے کہا۔ "تو بیٹے تم نے پہلے کیوں یہ مجھے نہ بتایا؟"

رحمت نے جواب دیا۔ "پہلے تو میں نے بتانا ضروری نہ سمجھا۔ بعد میں جب میں نے خدا کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کر لیا تو سوچا کہ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ لیکن میں نے اپنے ایک بزرگ سے اس بات کے بارے میں ذکر کیا اور انہوں نے بائبل میں سے ایک آیت مجھے پڑھ کر سنائی۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی کسی کا قصور کرتا ہے۔ تو اس کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس قصور کا اقرار کرے اور معافی مانگے۔"

بابا اقبال باتوں میں اتنا مگن تھا کہ وہ بھول ہی گیا کہ اُسے دیگچی میں چاول بھی ڈالنے تھے۔ جھاڑن سے دیگچی پکڑ کر اس نے چولھے پر رکھی اور بولا

"رحمت اگر میں اس طرح ہی کرتا رہا تو رات کا کھانا کب پکے گا !!! "

جب بابا دیگچی میں جلدی جلدی چمچ ہلا رہا تھا تو رحمت بڑے غور سے ٹکٹکی باندھے اقبال کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے ایسے معلوم ہُوا جیسے بابا اقبال ناراض نہیں ہے۔ اور اُس کا یہ اندازہ صحیح نکلا۔

اقبال دل میں بہت ہی خوش تھا کہ رحمت نے اتنی جرأت دکھائی کہ اپنے قصور کا اقرار کر کے اُس سے معافی مانگی ہے۔ جن مسیحیوں کو وہ جانتا تھا اُن سے رحمت کی یہ بات کتنی مختلف تھی۔ اُس نے رحمت کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا "اگر تمہاری بائبل شریف میں یہ لکھا ہے، تو وہ بہت اچھی کتاب ہے۔ میرے گھر میں بھی ایک انجیل مُقدس ہے۔ اب میرا خیال ہے۔ مَیں اُسے پڑھوں گا۔ شاید اُس میں جو باتیں میں نہ سمجھ سکوں وہ تم مجھے سمجھا سکو گے۔"

اُس شام جب رحمت اپنے گھر جا رہا تھا تو خوشی سے اُسے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہوا میں چل رہا ہو۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ زور زور سے گائے۔ اُس نے دل میں کہا "اب بابا اقبال کو مَیں نے اپنے ایمان کے بارے میں بتا دیا ہے۔ اب تو مجھے اور بھی زیادہ احتیاط سے کام کرنا ہوگا تاکہ اپنے کسی بھی غلط کام سے میں خُداوند یسوع کے نام کو بدنام نہ کرنے والا ٹھہروں۔" پھر اُس نے گہری سانس لی اور دِل میں کہا "کاش میں کلام کو اور اچھی طرح سمجھ سکتا تو میں بابا اقبال کو بھی ہر بات سمجھا سکتا۔ لیکن خیر اب میں جس قدر بھی ممکن ہوا کلام کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کروں گا۔"

جب وہ سٹاپ پر بس کا انتظار کر رہا تھا تو اُس نے اپنے خاندان کے افراد پر غور کرنا شروع کیا۔ "کاش وُہ بھی سچے دِل سے خُداوند یسوع کو جان

لیں اور اُس سے پیار کریں۔ لیکن ابھی تو کسی کو بھی خُداوند یسُوع سے ذرا سا بھی پیار نہیں ہے۔"

اب اُس کے ماں باپ اور بھائی بہنیں اُس کے دل پر ایک بہت بڑا بوجھ بن گئے۔ آج پہلی بار اُس نے یہ محسوس کیا کہ وُہ نہ اِسی دُنیا میں پُوری خوشی حاصل کرنے کی اُمید کر سکتے ہیں نہ اگلے جہان میں۔ پھر اُس نے دل میں کہا: "لیکن میری دلی تمنّا ہے۔ کہ وہ بھی آسمان پر جائیں۔ کیوں کہ مجھے وُہ سب بہت عزیز ہیں۔ اُسی وقت ایک اور خیال اُس کے دل میں آیا: "کیوں نہ میں خُداوند یسُوع سے کہوں اور اُس وقت کہتا رہوں جب تک کہ ایک ایک خُداوند یسوع کو پیار کرنا نہ سیکھ لے۔"

تمام شُد